SIECT

نومبر Nov. 2021

www.shibliinternational.com

ISSN: 2581-9216

ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد

Urdu Monthly SADA E SHIBLI Hyderabad

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

قیمت: -/20 روپے

Issue45_شمارہ Vol4 جلد

نومبر: Nov :2021

ماہنامہ حیدرآباد

صدائے شبلی

مدیر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران: ڈاکٹر سراج احمد انصاری ☆ ڈاکٹر عبدالقدوس ☆ ابوہریرہ یوسفی

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، پروفیسر مظفر علی شہ میری
پروفیسر محسن عثمانی ندوی، پروفیسر ابوالکلام
پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی، ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، مفتی محمد فاروق قاسمی
مولانا ارشاد الحق مدنی، مولانا محمد مساعد ہلال احیائی
اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ، محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر جاوید کمال، ڈاکٹر ناظم علی، ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر غوثیہ بانو، ڈاکٹر سید امام حبیب قادری، ڈاکٹر سمیہ تمکین، ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ، ڈاکٹر مصطفیٰ خان، مولانا عبدالوحید ندوی، مولانا احمد نور عینی، ڈاکٹر مصلح الدین نظامی، ابوہریرہ ایوبی، محسن خان

SADA E SHIBLI
A/c: 1327102000023922
Ifsc: IBKL0001327
IDBI Bank: CHARMINAR HYD, T.S

قیمت فی شمارہ: 20 سالانہ: 220
رجسٹرڈ ڈاک: 350- بیرونی ممالک: 50 / امریکی ڈالر
خصوصی تعاون: 2000

ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ

Mob: 9392533661 - 8317692718

Email: sadaeshibli@gmail.com

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352, B1, 2nd Floor, Bafana Complex,
Near Asfya Masjid Dabirpura Road, Purani Haveli, Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اپنی بات	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۵
۲	ہم پاسباں ہیں اس کے وہ پاسباں ہمارا	مولانا اسلم جیراج پوری	۶
۳	نعت رسول ﷺ	فہیم اختر	۶
۴	اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۷
۵	نجات کا اٹل قانون	مولانا حبیب الرحمٰن	۸
۶	ہزاروں دعوتیں ایسی کہ.....	خیر النساء علیم	۱۰
۷	غزل	ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی	۱۲
۸	الکٹرانک میڈیا کے ذریعہ اردو زبان وادب کا فروغ	محمد وحید الدین	۱۳
۹	آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں کے ادوار۔ایک نظر	طلعت صدیقی	۱۷
۱۰	دکنی ادب کا مہتاب باقر آگاہ	نعمت النساء	۲۱
۱۱	غزل	شاہ نواز ہاشمی	۲۵
۱۲	اردو ادب میں انشائیہ کا ارتقائی سفر	وسیم بیگم	۲۶
۱۳	رباعی فن اور تکنیک	محمد خواجہ محی الدین	۲۹
۱۴	غالب شناسی کی تحقیقی اور تنقیدی اہمیت	محمد شوکت فہیم	۳۴
۱۵	صحافت کی تعریف، مفہوم اور اہمیت	عبدالحفیظ رحمانی	۳۷
۱۶	اردو صحافت، فن اور روایات	سعیدہ رخسانہ بیگم	۴۰
۱۷	اعلامیہ	ادارہ	۴۲

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

جناب **ابو سفیان** اعظمی، مقیم حال ممبئی...جناب **محمد یوسف** بن الحاج محمد منیر الدین عرف ولی مرحوم، حیدرآباد

مفتی **محمد فاروق قاسمی**۔صدر علماء کونسل وجے واڑہ، آندھرا پردیش

ڈاکٹر سید **جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد...مولانا **منصور احمد قاسمی**، معین آباد، تلنگانہ

الحاج **رئیس احمد اقبال**، انجینئر صدر سہارا ویلفیئر سوسائٹی، حیدرآباد الحاج **محمد زکریا** انجینئر (داماد استاذ الاساتذہ حضرت عبدالرحمٰن جامیؒ) مقیم حال دبئی...ڈاکٹر **شہباز احمد**، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج چارمینار، حیدرآباد

مولانا **محمد عبدالقادر سعود** ناظم جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد...الحاج **محمد قمرالدین**، نبیل کالونی بارکس حیدرآباد...الحاج **محمد عبدالکریم**۔صدر مسجد اشرف کریم کشن باغ، حیدرآباد

اپنی بات

تاریخ عالم اٹھالیں اور بغور مطالعہ کریں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ جو عالمی شخصیات مشہور و معروف ہیں وہ اپنے منفرد کام یا اعلیٰ کمالات، نہ کہ اپنی تاریخ پیدائش یا تاریخ وفات کی وجہ سے۔ موجودہ دور میں آفاقی شخصیت کو ان کی تاریخ ولادت یا تاریخ وصال پر نشستن، گفتن، خوردن کرکے یاد کرلیا جاتا ہے۔ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے، اے کاش ہم لوگ ماہِ نومبر کی ۹ر تاریخ کو یومِ اردو جشنِ اقبال کے بجائے فکر اقبال، یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم پر غور کرتے اور ۱۰ر نومبر کو یومِ سائنس کے ساتھ ساتھ شیر میسور ٹیپو سلطان کی بہادری اور ان کے اس قول کو یاد رکھتے کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی کے برابر ہے۔ ہم اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہ ہم اپنے آزاد ملک میں شیر کی طرح زندگی گزار رہے ہیں یا گیدڑ کی طرح؟ ۱۱ر نومبر کو ہمارے ملک میں پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کی یومِ پیدائش کے موقع پر یومِ تعلیم منایا جاتا ہے۔ یقیناً تعلیم معاشرے کی بڑی طاقت ہے۔ اسے عام کرنا ہر دانشور پر لازم ہے۔ آئیں ہم عہد کریں کہ تعلیم کو عام کریں گے اور تعلیمی مقاصد میں معرفت خداوندی، معاشرے میں اخلاق و کردار، انصاف اور خدمت خلق کا جذبہ وجود میں لائیں گے۔ اس کے لیے ہر متفکر کو آگے آنے کی ضرورت ہے۔

بقول مولانا آزاد کے:

''زندگی کے معنیٰ یہی ہیں کہ ہم بوجھ اٹھائیں، ڈر کر نہیں بلکہ ہمت سے مردوں کی طرح اٹھائیں۔ ٹھوکر انہیں کو لگتی ہے جو چلنا چاہتے ہیں''۔

ہمارے ملک کا تقریباً ہر شہری امن، اتحاد، باہمی اعتماد اور حب الوطنی کی بات کرتا ہے مگر آخر کیا وجہ ہوتی ہے کہ آئے دن ایک مخصوص طبقہ کو ذہنی، مالی، مذہبی نقصان پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حالیہ دنوں میں جو تری پورہ ریاست میں مساجد، دکانوں اور مکانات پر حملہ کرنے کی تصویریں سوشل میڈیا کے ذریعہ منظرِ عام پر آئی ہیں۔ اسے دیکھ کر دل و زبان سے یہی سوال اٹھتا ہے کہ ہمارے آباواجداد نے ملک کو یہی دن دیکھنے کے لیے آزاد کرایا تھا، مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں کو چاہئے کہ اس طرح کے ماحول پر انسانیت کی بقا اور ملک کے مفاد پر سخت سے سخت نوٹ لیں تاکہ اس طرح کے واقعات کا اعادہ نہ ہو۔

شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ کی ۳۲۷ر گز اراضی پر تعمیری کام جاری ہے۔ ان شاء اللہ اس ماہ کے آخر تک پہلا چھت مکمل ہوجائے گا۔ معاونین، محبین سے گزارش ہے کہ دعاؤں میں یاد رکھیں اور تعمیری کام میں حصہ لے کر ثواب دارین حاصل کریں۔

محمد محامد ہلال اعظمی

مولانا اسلم جیراجپوری 1955-1882

ہم پاسباں ہیں اس کے وہ پاسباں ہمارا

وہ عرب کہ دینِ برحق ہوا جس سے آشکارا
مٹی تیرگیِ باطل، کیا کفر نے کنارا
حرم خدا ہے اس میں حرمِ نبی ہے اس میں
جہاں بہرِ پاسبانی ہیں ملائکہ صف آرا
ہے اسی میں گھر خدا کا جو چراغ ہے ہدیٰ کا
کہ جہانِ تیرہ میں ہے وہی حق کا اک منارا
وہ کتابِ آسمانی جو ہے نورِ جاودانی
اسی سرزمیں میں رب نے اسے عرش سے اتارا
اسی خاک میں ہے پنہاں وہ رسولِ پاک یزداں
ہوا جس کے اک اشارے میں مہ فلک دو پارا
حرمین جانے والے قدم ادب سنبھالے
کہ وہاں کا ذرہ ذرہ مری آنکھ کا ہے تارا
کفِ پاشاہ دیں کے لؔ ہوں گے اس نے بوسے
مجھے سنگِ پارہ بطحا کا ہے لعل سے بھی پیارا
یہ حرم کی سرزمیں ہے یہ متاعِ اہلِ دیں ہے
نہ کسی کی ہے تجارت نہ کسی کا ہے اجارا
کوء ملحدی کا شیوہ یہاں چل نہیں سکے گا
تجھے خود ہی پھونک دے گا ترے فتنے کا شرارا
یہ حریمِ کبریاء کہ ہے قلع ؟ خداء
یہاں غیر کی رساء نہیں مطلقاً گوارا
یہ جزیر ؟ عرب ہے یہاں آستانِ رب ہے
کہ ہم اس کا پاسباں ہیں وہ ہے پاسباں ہمارا

فہیم اختر۔لندن برطانیہ

نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

زباں پر جب مصطفیٰ کا نام آتا ہے
مرے دل کو میسر دائمی آرام ہوتا ہے

خدا کا ذکر اور ذکرِ محمد مصطفیٰ کرنا
غلامانِ محمد کو یہی اک کام آتا ہے

پہونچ کر شہرِ مکہ جو نہ جائے جانب طیبہ
سمجھئے بارگاہِ رب سے وہ ناکام آتا ہے

جسے سچی محبت ہو شہنشاہِ مدینہ سے
اسی کے ہاتھ وحدت کا یقیناً جام آتا ہے

بلایا جاؤں گا طیبہ میں جس دن اے فہیم اختر
خیال اس دن کا اب مجھ کو بھی صبح وشام آتا ہے

اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

تواضع: گھر کا کام کاج خود کرتے، کپڑوں میں پیوند لگاتے، گھر میں خود جھاڑو دیتے، دودھ دوہ لیتے، بازار سے سودا لاتے، جوتی پھٹ جاتی تو خود گانٹھ لیتے (گدھے کی سواری سے آپ کو عار نہ تھا، غلاموں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھنے اور ان کے ساتھ کھانا کھانے سے پرہیز نہ تھا) ایک دفعہ گھر سے باہر تشریف لائے، لوگ تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے، فرمایا کہ ''اہل عجم کی طرح تعظیم کے لیے نہ اٹھو''۔

غریب سے غریب بیمار ہوتا تو عیادت کو تشریف لے جاتے، مفلسوں اور فقیروں کے ہاں جا کر ان کے ساتھ بیٹھتے، صحابہؓ تو اس طرح بیٹھتے کہ امتیازی حیثیت کی بنا پر کوئی آپ کو پہچان نہ سکتا، کسی مجمع میں جاتے تو جہاں جگہ مل جاتی بیٹھ جاتے۔

ایک دفعہ ایک شخص ملنے آیا لیکن نبوت کا رعب اس قدر طاری ہوا کہ کانپنے لگا، آپؐ نے فرمایا ''گھبراؤ نہیں میں بادشاہ نہیں، ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت پکا کر کھایا کرتی تھی''۔

تواضع اور خاکساری کی راہ سے آپؐ اکڑ و بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے تھے اور فرمایا کرتے تھے ''میں بندہ اور بندوں کی طرح کھاتا اور بندوں ہی کی طرح بیٹھتا ہوں''

ایک دفعہ کھانے کے موقع پر جگہ تنگ تھی اور لوگ زیادہ آ گئے، آپؐ اکڑوں بیٹھ گئے کہ جگہ نکل آئے، ایک بدو مجلس میں شریک تھا، اس نے کہا محمدؐ! یہ کیا طرزِ نشست ہے، آپؐ نے فرمایا خدا نے مجھے خاک سار بندہ بنایا ہے، جبار اور سرکش نہیں بنایا ہے۔

تواضع کی انتہا یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے متعلق جائز تعظیمی الفاظ بھی نہیں پسند فرماتے، ایک بار ایک شخص نے ان الفاظ سے آپ کو خطاب کیا ''اے ہمارے آقا، اور ہمارے آقا کے فرزند اور اے ہم میں سب سے بہتر اور ہم میں سب سے بہتر کے فرزند'' آپؐ نے فرمایا، لوگو! پرہیزگاری اختیار کرو، شیطان تمہیں گمراہ نہ دے، میں عبداللہ کا بیٹا محمدؐ ہوں، خدا کا بندہ اور اس کا رسول، مجھ کو خدا نے جو مرتبہ بخشا، میں پسند نہیں کرتا کہ تم مجھے اس سے زیادہ بڑھاؤ''۔

ایک دفعہ ایک شخص نے آپ کو یا خیر البریۃ (یعنی اے بہترین خلق) کہہ کر مخاطب کیا، آپؐ نے فرمایا وہ ابراہیم تھے۔

عبداللہ بن شخیر کا بیان ہے کہ بنی عامر کی شفارت کے ساتھ جب ہم لوگ خدمتِ اقدس میں آئے تو عرض کی کہ حضورؐ ہمارے آقا (سید) ہیں، ارشاد فرمایا کہ ''آقا خدا ہے'' پھر ہم لوگوں نے عرض کی کہ آپؐ ہم میں سب سے افضل اور سب سے برتر ہیں، ارشاد ہوا کہ ''بات کہو تو دیکھ لو کہ شیطان تو تم کو نہیں چلا رہا ہے''۔

مدینہ منورہ میں ایک عورت تھی، جس کے دماغ میں کچھ فتور تھا، آپؐ کی خدمت میں آئی اور کہا محمد ﷺ! مجھ کو تم سے کام ہے، فرمایا جہاں کہو چل سکتا ہوں، وہ آپ کو ایک کوچہ میں لوا گئی اور وہیں بیٹھ گئی، آپؐ بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئے، اور جو کام تھا انجام دے دیا۔

(سیرۃ النبیؐ، جلد: دوم، ص: ۲۶۵/۲۶۶)

مولانا حبیب الرحمن۔حیدرآباد

نجات کا اٹل قانون

اور قُربِ الٰہی کا ذریعہ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (الزمر۳)'' (بزرگانِ دین کو اللہ سمجھ کر عبادت نہیں کرتے بلکہ) ہم بزرگوں کی عبادت (نذر، نیاز، فاتحہ، درود) صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو اللہ کی رحمت کے مستحق بنادیں'' اور ان کے جنم دن منانے کو بڑی عبادت اور بڑا کارِ ثواب سمجھتے ہیں اور مسلمان الّا ماشاء اللہ طریقت، حقیقت، معرفت کے عنوان سے وحدۃ الوجود ہر شکل میں اللہ ہے، کا عقیدہ رکھتے ہیں اور اس کا نام علم لدنی اور سینہ بہ سینہ رکھ چھوڑا ہے۔ زندگی میں اللہ ورسولؐ کی فرمانبرداری کرنے کے بجائے عرس، صندل، پنکھا، جھیلہ، جھنڈے قوالی اور درود وظائف، چلے، مراقبے وضربات اور آثار کی زیارت سے برکت حاصل ہونے کو سنت والجماعت ہونے کی نشانی سمجھ لیے ہیں اور یہی سمجھایا بھی جارہا ہے حالانکہ سنت والجماعت تو صرف وہی ہوسکتا ہے جس کے پاس صرف کتاب اللہ، سنت رسولؐ اور اسوہ صحابہؓ معیار وسند ہو اور اس پر عمل کرنے کی کوشش بھی کرے۔

عشقِ الٰہی وحبِّ رسول ﷺ

اللہ ورسول سے عقیدت ومحبت کا اظہار کا واحد طریقہ رسولؐ کی پیروی واطاعت کو قرار دیا گیا ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (آل عمران)'' (اے نبیؐ) کہو اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ بھی تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا، اللہ بڑا بخشنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے''

اور ایمان والوں کی خصوصی صفت اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ''اللہ کی محبت میں شدید ہوتے ہیں'' (البقرہ ۱۶۵) بتائی گئی ہے۔

نبی ﷺ نے فرمایا ''جس نے میری سنت کو محبوب رکھا وہی مجھ سے محبت کرتا ہے اور جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ میرا امتی نہیں، جس نے میری نافرمانی کی وہ میرا منکر ہے''۔ (حدیث) اللہ ورسولؐ سے سچی وحقیقی محبت رکھنے والے صحابہ کرامؓ تھے۔ اس لیے ان کے اسوہ کو سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ (النساء ۱۱۵)'' ایمان والوں کا راستہ'' اور اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ (البقرہ ۱۳)'' اس طرح ایمان لاؤ جس طرح اصحابِ رسول ایمان لائے'' اور فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (البقرہ ۱۳۷)'' پھر اگر وہ اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم (اصحابِ رسولؐ) ایمان لائے ہو تو بے شک وہ راہ پا جائیں گے'' اور وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ

وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (توبہ ۱۰۰)'' (اور ہجرت کرنے میں) اور مہاجرین کی مدد کرنے میں پہل کرنے والے اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے والے اور وہ لوگ بھی جو ان کی لگن کے ساتھ پیروی کریں گے، اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہو جائیں گے'' اور نبی ﷺ مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ ''میں اور میرے صحابہؓ جس طریقہ پر ہیں'' کو اہلِ سنت والجماعت فرما کر قیامت تک کے ایمان والوں کے لیے صحابہؓ کو ایمان وعمل میں معیار وکسوٹی قرار دیا ہے۔ اس کے باوجود جو اسوۂ صحابہؓ کو ایمان وعمل میں معیار وکسوٹی نہیں مانتے ان کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔

صحابہ کرامؓ نہ یوم ولادت، نہ یوم وفات، نہ یادِ فلاں منائے، نہ میلاد وسیرۃ کے جلسے کیے، نہ جلوس نکالے، نہ سلام پڑھے، نہ درود کی محفلیں جمائے، نہ ختم قرآن کیے، نہ ختم بخاری، نہ ختم خواجگان، نہ آیتِ کریمہ کے دسترخوان بچھائے، نہ وظائف، نہ اوراد، نہ چلے، نہ مراقبے، نہ مروجہ طریقے پر ذکر کیے اور نہ ضربات لگائے، اس لیے ہر وہ طریقہ جو اسوۂ صحابہؓ کے خلاف ہو یا سوا ہو، اس کا بدعت یعنی گمراہی ہونا یقینی ہے۔ نیک مقصد کو حاصل کرنے کا طریقہ بھی صحیح ہونا لازمی ہے۔ ورنہ ثواب کے بجائے الٹا پکڑ ہوگی۔ جس کام کے کرنے کا حکم نہیں اس کو نیکی سمجھ کر کرنا دین کو نہ صرف ناقص قرار دینا ہے بلکہ بگاڑ دینا ہے۔ وَمَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ (البقرہ) ''اور جو اللہ کی نعمت (دین) کو بدل ڈالے جبکہ وہ ان کے پاس آچکا ہے تو یقیناً اللہ سخت سزا دینے والا ہے'' اس لیے یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ''جو بات کہتے ہیں مگر اس پر عمل نہیں کرتے اور وہ کام کرتے ہیں جس کا حکم نہیں'' کے خلاف اللہ کے رسولؐ نے جہاد کرنے کا حکم دیا ہے۔ (مسلم)۔

اُمتِ محمدیہ کے فرائض

آپؐ کی امت میں ہمارا شمار ہونے کے لیے لازمی وضروری ہے کہ ہم آپؐ کی لائی ہوئی تعلیمات کو دنیا کے تمام انسانوں تک پہنچانے کی کوشش کریں۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰهِ عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ (یوسف ۱۰۸) ''اے نبیؐ! کہو یہ میرا طریقہ (میری سنت) ہے کہ میں تم کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں سمجھ بوجھ کر اور میری پیروی کرنے والے بھی (یہی کام کریں گے)''۔

یہ کام کرنے ہی سے ہم امت وسط اور خیرِ امت ہو سکتے ہیں۔ اس فرضِ منصبی سے غفلت ولاپروائی کی وجہ سے ہی تو مسلمان اہلِ باطل کے تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں (البقرہ ۶۱، آل عمران ۱۱۲) یہ حالتِ عذاب اس وقت تک نہیں بدل سکتی جب تک ہم اپنا فرضِ منصبی ادا کرنے کی کوشش نہ کریں۔ مسلمانوں کی حیاتِ ابدی کی طلب سے گرمانے کی بجائے اظہارِ عقیدت ومحبت وتبلیغ واصلاح کے من گھڑت طریقے اختیار کرنے میں افراد، جماعتیں اور حکومتیں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

خیر النساء علیم۔حیدرآباد

ہزاروں دعوتیں ایسی کہ.....

اللہ کے فضل وکرم سے آج کل تقاریب کا شور شرابہ بام عروج پر ہے۔ اکثر وبیشتر دعوتوں کے مدعوئین میں ناچیز بھی شامل فہرست رہا کرتی ہے۔ یوں تو بڑی چھوٹی دعوتوں کا سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے، کچھ عزیزوں اور رشتہ داروں میں کچھ دوستوں اور ملاقاتیوں میں ، کچھ اڑوس پڑوس میں.....بہرحال ہم نے طے کر رکھا ہے کہ دعوت طعام میں جتنا ہوسکے معذرت خواہی کے طالب ہی رہیں گے۔ حالانکہ ایسا کرنا خلاف سنت ہے لیکن اب کیا، کیا جائے، اس کے بناء کوئی چارہ نہیں۔ معذرت خواہی کا سبب موقع طعام پر آپ کی نظروں کے سامنے رہے گا۔ بشرطیکہ آپ غور فرمائیں یا پھر زیر عنوان مضمون کا جائزہ بھی مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ ہمارے یہاں عموماً سانچک مہندی میں بھی تناول طعام کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

شادی کے دن کا ماحول تناول طعام کی وجہ سے کافی تکالیف کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے کیونکہ نکاح ہونے تک سارے مہمانوں کے جمع ہونے تک دس تو بج ہی جاتے ہیں اور جیسے ہی کھانا لگنے کا سگنل ملتا ہے سارے مہمان ایک وقت میں کھانے کی میزوں پر پہنچنے کے لیے تقریباً دوڑتے ہوئے پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، جس کی وجہ سے عمر رسیدہ خواتین اور بچے خاص طور پر پریشان ہوجاتے ہیں۔ میزیں پُر ہونے کی وجہ سے پھر واپس اپنی نشست پر آجانا پڑتا ہے، جو کہ ایک صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے۔

مہندی اور شادی کے بعد ولیمہ کا دن یا ولیمہ کا ڈنر کافی آزمائشی ہوتا ہے کیونکہ ولیمہ میں دلہا دلہن دس یا گیارہ بجے سے پہلے شادی خانہ میں نہیں پہنچتے، جس کی وجہ سے مہمانوں کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دعوت طعام کے بارے میں ہم ہی نہیں سبھی بخوبی واقف ہیں، لیکن حالات سے سمجھوتا دانش مندی کی علامت ہے۔ میری دانست میں یہ ایک حل طلب مسئلہ ہے، جس کا حل ڈھونڈنے ہم خود ہی اکثر شریک طعام ہوا کرتے ہیں۔ آخر کمزور طبع انسان جو ہیں.....

اکثر مہمانوں کے لیے جس طرف کھانے کا انتظام کیا گیا ہے اس طرف کی کرسیاں سنبھال لیتے ہیں۔ جیسے ہی بیرے نے دروازہ کھولا۔ سبھی فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جیسے یکا یک کرفیو کے نفاذ پر ہر کوئی گھر کی راہ چل پڑا ہو۔ بالکل اسی طرح سبھی کھانے کی سمت رواں دواں کرسیوں کو ہٹاتے گھستے گھساتے جگہ اور کھانا دونوں حاصل کرنے کی دھن میں کبھی تیزی کبھی دھکے لگا کر اور دھکے کھا کر آگے ہی آگے بڑھتے چلے۔ پیچھے آنے والے جائیں بھاڑ میں وہ گرے یا مرے ہمیں کیا لینا دینا۔ ذرا سا دھکہ آگے والے کو بہت آگے پہنچا دیتا ہے۔ اگر وہ زیادہ ہی آگے نکل گیا تو غصہ میں مڑ کر ضرور دیکھے گا.....''مڑ مڑ کے نہ دیکھ مڑ مڑ کے'' کے مصداق۔ مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں کس کے دھکے سے آپ آگے بڑھ گئے ہیں کچھ پتا نہیں چلتا۔

آگے قدم بڑھانا ہی مقصد کو کامیاب کرسکتا ہے۔ وہ بھی گنگناتے ہوئے۔ ''آگے قدم بڑھائے جا۔خوشی کے گیت گائے جا''۔ورنہ دھکّے کی کوفت میں کھانے کی جگہ ملنا مشکل۔کبھی قدم روکتے۔کبھی قدم بڑھاتے جلدی پہنچنے کی کوشش میں شاملِ تماشا ہوگئے۔جیسے ہی کھانے کے قریب پہنچے دم میں دم آیا.....مگر یہ کیا؟ ہر جگہ ہاؤس فل آگے بڑھنے ہی والے تھے کہ اڈوانس بکنگ کا اعلان۔''ہائے رے قسمت منزل پر پہنچ کر بے یار و مددگار''۔

ہر طرف نظریں دوڑائیں۔کوئی فائدہ نہیں۔سبھی سر جھکائے اپنی کارروائی میں مصروف۔تب ہمیں محسوس ہوا۔''رشتہ، رشتہ نہ رہا۔دوست دوست نہ رہا''۔اپنی عقل کا ماتم مناتے ہوئے شرمندگی سے واپسی کا پروگرام بنا ہی رہے تھے کہ دور سے کسی نے ہاتھ ہلا کر ہمیں آنے کا سگنل دیا۔ہم دل ہی دل میں خوشی ہوئے بلانے والے کے لیے دل میں دعائے خیر لیے سگنل کی سمت بڑھے لیکن تب تک سگنل گر چکا تھا۔پھر بھی پروردگار کے کرم سے راستہ مل ہی گیا۔میزبان کے قریبی عزیز نے جگہ اور کھانے کی فراہمی میں ہماری مدد فرمائی ہم Thank You اور Sorry کے بالکل خلاف ہیں۔اس لیے ہم نے انہیں بھی اپنی دعاؤں میں شامل کرلیا.....

لیکن اب ہمیں ایسا لگا جیسے کوئی دور جانے والے یا کوئی خاص کام والے کھانے کی سمت تیزی سے بڑھنے کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں لیکن یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا۔کیونکہ وہ سبھی جو ریس میں آگے تھے،کھانے کے بعد پان چباتے گپ شپ ہانکے جارہے تھے ان کا واپسی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔اب کیا کیا جائے برے پھنسے نہ تو کھا سکتے۔ آخر جائیں تو جائیں کہاں.....

اگر بنا کھائے چلے جائیں تو میزبان سے زیادہ مہمان کو تشویش۔بات کا پتا چلانے کے لیے بے چین۔کیا ہوا ہوگا۔کیوں انہوں نے کھانا نہیں کھایا اور نہ جانے کیا کیا؟

وقت کی للکار، پیٹ کی پکار، کمبخت سبھی دعوت طعام کے گلے کا ہار اگر دعوت طعام زیادہ مہمانوں کی ہو تو پھر اللہ کی پناہ، کوئی پرسان حال نہیں میزبان کا دور دور تک پتا نہیں ایسے ہی ایک دعوت طعام نے ہمیں طعام تو ترک کرنے کا شدت سے احساس دلایا، لیکن عزیز داری پھر ہمیں کھینچے لے گئی۔حالانکہ دعوت کا اہتمام کافی دور تھا۔فاصلے کی دشواریوں سے کون واقف نہیں۔شامت پکاری کیا کرتے پہنچ گئے۔اسی اثناء چند مخصوص دوست واحباب کو کھانے کے لیے بلایا جارہا تھا۔تب سبھی نے موقع کو غنیمت جان کر ہلہ بول دیا۔میزبان باب الداخلہ پر دیوار بنے کھڑے دونوں ہاتھوں سے راستہ روکتے چلا رہے تھے کہ ''مت آیئے جگہ نہیں ہے''۔لیکن مہمانوں کو جگہ سے کیا واسطہ وہ خود اپنی جگہ بنانا جانتے ہیں۔لوگوں نے میزبان کے ہاتھوں کو ہٹاتے ہوئے اندر جانے میں کامیابی حاصل کی۔ایک میز پر بجائے آٹھ کے دس موجود۔کھانے کی سپلائی بے ترتیب۔کوئی پوچھنے والا نہیں۔بار بار منگوانے پر بیرے انجان۔میزبان دور اجنبی بنے کھڑے رہے۔غصہ میں آپے سے باہر۔ادھر مہمان بھی جیسا بھی ہو چلے گا فارمولے پر عمل پیرا۔ہم اپنے آپ سے خفا۔''گیدڑ کی موت پکاری تو شہر کا رخ'' والا احساس لیے واپسی کی تیاری میں لگے رہے۔لیکن دوسروں کی لگام کو کیا لگام اتنی صلواتیں سنائے کہ میزبان سنتے ہوئے بھی ان سنی کردیے.....

آج تک ہمیں اپنی عقل اور انداز فکر پر ناز تھا۔ لیکن فی زمانہ دعوت طعام میں شرکت پر شرکت نے ہماری عقل کا پردہ چاک کر دیا اور ثابت کر دیا کہ دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک عقلمند موجود ہے تم کس کھیت کی مولی ہو۔ ایسے واقعات تو ہر تقریب کا معمول اور ایک معمولی سی بات بھی۔ پہلے آپ پہلے آپ کا زمانہ گزر چکا۔

اب تو پہلے ہم پہلے ہم کا نیا دور ہے۔

یہی حال ہمارا بھی غلطی کے بعد دہرانا ہمارا معمول..... عہد کرتے اور پھر عہد شکنی بھی۔ آخر میں شرمندگی، پچھتاوا، مایوسی طریقۂ علاج سمجھ سے باہر۔ مشورہ ناقابل قبول، سوچ وفکر کی راہ میں ہزاروں روڑھے..... کیا کریں۔ کیا نہ کریں.....

.....(بقیہ ص:۱۶ کا)

طے کرتے ہوئے انسانوں کے اعصاب پر قابو کر لے گا۔ ایسے میں ہم اردو والوں کا بھی فرض بنتا ہے کہ اپنی زبان اور ادبی سرمایہ کو ہر عام وخواص تک اس ذریعہ سے پہنچائیں۔ سوشیل میڈیا کے واسطہ سے اردو کا زیادہ سے زیادہ استعمال اردو کے مستقبل کو تابناک بنا سکتا ہے۔

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نام ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

حوالہ جات:

(۱) رفعت سروش، آل انڈیا اردو اور ریڈیو، صفحہ 13
(۲) ڈاکٹر محمد شکیل اختر، اردو میں نشریاتی ادب، صفحہ 208
(۳) ڈاکٹر حسام الدین فاروقی، اردو زبان کے فروغ میں ریڈیو ٹیلی ویژن کا حصہ، صفحہ 34

ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی
ایسوسی ایٹ پروفیسر عین شمس یونیورسٹی قاہرہ (مصر)

غزل

دیکھتے ہیں مصر والے جب کنارا نیل کا
یاد آجاتا ہے ان کو سارا قصہ نیل کا

چیر کر سینہ ہوئے جو پار موسیٰ نیل کا
کر گیا فرعون کو غرقاب دھارا نیل کا

مصر آؤ دوستو تم کو اگر فرصت ملے
کم سے کم اک بار تو دیکھو نظارہ نیل کا

عمر بھر وہ بھول پاتا ہی نہیں ہے ذائقہ
جو کوئی پیتا ہے میٹھا پانی دریا نیل کا

غور سے دیکھیں تو یہ لگتا ہے اکثر دوستو
آسماں پر پڑ رہا ہے نیلا سایہ نیل کا

عشق، تنہائی، خوشی اور غم کے ان لمحات میں
قاہرہ والوں کو ملتا ہے سہارا نیل کا

اس کی موجیں خون بن کر دوڑتی ہیں جسم میں
ان رگوں میں موجزن ہے قطرہ قطرہ نیل کا

بیٹی ہے تو اے ولا اس غیر فانی نیل کی
تیرا ہر اک شعر ہے گویا کہ نغمہ نیل کا

محمد وحید الدین۔اسسٹنٹ پروفیسر(W) IPGDC نامپلی،حیدرآباد

الکٹرانک میڈیا کے ذریعہ اردو زبان وادب کا فروغ

آج سے تقریباً ایک صدی قبل الکٹرانک میڈیا کے فروغ کا دور شروع ہوتا ہے جس میں ہم ریڈیو، سنیما اور ٹیلی ویژن جیسے اختراعی اشیاء سے روشناس ہوتے ہیں۔ جبکہ بیسویں صدی کے آخر میں ہم انٹرنٹ سے روشناس ہوتے ہیں اور یہی انٹرنٹ اکیسویں صدی کے آغاز سے تا حال دنیا میں کئی انقلابی تبدیلیاں لاچکا ہے۔

زیر بحث عنوان میں سب سے پہلے بات ہوگی ریڈیو کی۔ایک صدی قبل مارکونی نے 1920ء میں پہلی مرتبہ اپنی تجربہ گاہ سے ریڈیو نشریات پیش کرتے ہوئے تاریخ رقم کی تھی۔ ریڈیو نے بیسویں صدی کے اواخر تک خوب فروغ پایا۔ 70 اور 80 کے دہے تک بھی دور دراز علاقوں میں ترسیل کا یہ واحد ذریعہ ہوا کرتا تھا۔ ریڈیو کے ذریعہ ہر طرح کی ترسیل کا کام لیا گیا جس میں تفریح طبع سے لے کر ادب و طب کی ترسیل بھی شامل ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان میں ریڈیو سروس کا باقاعدہ آغاز 1936ء میں ہوا۔اس وقت سارا برصغیر ہندوستان ہی ہوا کرتا تھا۔ ابتداء ریڈیو سروس انڈین اسٹیٹ براڈ کاسٹنگ سروس کے بینر تلے کام کرتا تھا بعدازاں اس کا نام تبدیل کرتے ہوئے آل انڈیا ریڈیو رکھا گیا۔آل انڈیا ریڈیو کی نشریات تمام ہندوستانی زبانوں بشمول اردو میں نشر کی جاتی تھیں۔ اس وقت اردو برصغیر کی زبان تھی اور اس کی عالمی بستیاں وجود میں نہیں آئیں تھیں۔اس طرح اس کا دائرہ کار صرف برصغیر ہی ہوا کرتا تھا۔آل انڈیا ریڈیو کے تقریباً ہر سنٹر سے مختلف اوقات میں اردو کے مختلف پروگرام نشر کئے جاتے رہے ہیں۔ رفعت سروش اپنی کتاب آل انڈیا ریڈیو اور اردو میں لکھتے ہیں کہ

''اگر اردو زبان کے تناظر میں بات کی جائے تو جہاں آل انڈیا ریڈیو کے قیام سے اردو زبان وادب کو فروغ حاصل ہوا وہاں یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو زبان نے آل انڈیا ریڈیو کے نرم و نازک پودے کو اس طرح سینچا کہ وہ تناور درخت بن گیا۔''[1]

جبکہ حسام الدین فاروقی اپنی تصنیف ''اردو زبان کے فروغ میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا حصہ'' میں آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہونے والے اردو نشریات کی فہرست معہ اسٹیشن کا نام، پروگرام اور اوقات درج کئے ہیں۔ ریڈیو سے نشر ہونے والے کچھ خاص اردو کی نشریات ذیل میں پیش کی جارہی ہیں۔

فیچر: یہ ریڈیو کی ایک مقبول عام صنف ہے جو کہ کسی بھی موضوع پر لکھے جاسکتے ہیں۔ ریڈیو کے لیے کئی بہترین فیچر لکھے گئے ہیں جس کی تفصیلات یہاں درج کرنا ناممکن ہے جس میں اردو ادب کے نامور ادیبوں اور شعراء پر فیچر لکھے گئے مثلاً قمر جمالی کا لکھا ہوا ''پوچھتے ہیں کہ غالب کون ہے'' اور مرزا محمود بیگ کا لکھا فیچر ''دلی کا ایک کوچہ'' قابل ذکر ہیں ان کے علاہ کئی ایک طویل فہرست آل انڈیا کے آرکائیوز میں موجود ہے۔

انٹرویو: انٹرویو بھی ریڈیو پروگراموں کا ایک دلچسپ اور پسندیدہ پروگرام ہے۔ یوں تو انٹرویو بہت سارے زمروں کے ہوتے ہیں جن میں ادبی زمرہ بھی شامل ہے۔ادبی انٹرویو کے پروگرام آل انڈیا ریڈیو کے تقریباً تمام اسٹیشنوں سے نشر کئے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر شکیل اختر نے اپنی کتاب ''اردو میں نشریاتی ادب'' میں ایک طویل فہرست درج کی ہے جس میں اردو ادب کے ممتاز شخصیتوں کے انٹرویو درج ہیں۔

تبصرے: نشریات کا یہ زمرہ پرنٹ میڈیا میں شائع ہونے والے تصانیف کے تبصروں سے مماثلت رکھتا ہے۔ یہاں پر بھی مختلف

مصنفین کی کتابوں پر تبصرے نشر کئے جاتے ہیں اس کی وجہ سے مصنف اور اس کی تخلیق کے متعلق بہت ساری معلومات سامعین کو حاصل ہوتی ہیں۔

مباحثہ: یہ زمرہ الکٹرانک میڈیا کا سب سے زیادہ مقبول عام اور بہت زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ ریڈیو کے ابتدائی دور میں اس کو مناظرہ کہا جاتا تھا۔ ڈاکٹر شکیل اختر نے ریڈیو پر نشر ہوئے ادبی مباحثوں کے فہرست اپنی کتاب ''اردو میں نشریاتی ادب'' میں درج کی ہے۔ جس میں سے علامہ اقبال کا شکوہ جواب شکوہ پر فراق گورکھپوری، مولانا عبد الماجد دریا آبادی، سعید انصاری اور پنڈت برج موہن دتہ تریہ کیفی کا مباحثہ ایک ہے۔ ان مباحثوں کی ایک طویل فہرست ہے۔

ریڈیائی ڈرامہ: جس طرح افسانوی ادب میں سب سے قدیم اور مقبول صنف ہے اسی طرح ریڈیو کی دنیا میں بھی یہ ابتداء ہی سے اپنی مقبولیت کے جھنڈے گاڑ چکا ہے۔ اردو افسانوی ادب کی اس صنف کو ریڈیو کی دنیا میں بہت زیادہ پزیرائی حاصل ہوئی۔ آل انڈیا ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں سے ڈرامے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد دونوں ملکوں میں نشر کئے جاتے رہے ہیں۔ ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھنے والوں کی ایک لمبی فہرست ہے جس کا ذکر یہاں ناممکن ہے۔ لیکن اردو ادب کے معتبر ادباء مثلاً راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، سعادت حسین منٹو، عصمت چغتائی وغیرہ نے ریڈیائی ڈرامے لکھے ہیں۔ ریڈیائی ڈرامہ کے لئے حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ افراد نے بہت گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ محمد معین الدین نے اپنی کتاب ''حیدرآباد کے مصنفین کے ریڈیائی ڈرامہ'' میں 196 ڈراموں کی فہرست درج کی ہے۔

افسانے: ریڈیو میں صنف ڈرامہ کے بعد کسی اور افسانوی ادب کو مقبولیت حاصل ہوئی ہے تو وہ افسانہ ہے۔ ڈاکٹر شکیل اختر نے اپنی کتاب میں 83 افسانوں کی فہرست دی ہے۔ جو کہ آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوئے ہیں۔

ریڈیائی مشاعرے: اس بات سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ آج اردو زبان زندہ ہے تو اس کی ایک وجہ مشاعرے اور اس کا شعری سرمایہ ہے۔ الکٹرانک میڈیا نے مشاعروں کو بہت زیادہ جلا بخشی ہے۔ الکٹرانک میڈیا پر مشاعروں کی شروعات ریڈیو سے ہی ہوئی۔ ریڈیو پر اردو مشاعروں کے نشریات کے آغاز کے سبب یہ ایک مخصوص مقام و ماحول سے نکل کر لاکھوں لوگوں تک پہنچنے لگے اور شعر و شاعری کا شغف رکھنے والے سامعین کے ذوق کی تسکین ہونے لگی۔ ان نشریات سے اردو زبان ان لوگوں تک بھی پہنچی جن کی یہ زبان نہیں تھی۔

اردو میں نشریاتی ادب میں ڈاکٹر شکیل اختر لکھتے ہیں کہ ''بہر حال یہ کہا جاسکتا ہے کہ آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہونے والے مشاعروں نے سامعین کے ذہن پر خوشگوار اثرات مرتب کئے ہیں اور انھیں باذوق اور شعر فہم بنانے میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اردو کے شعری روایت میں ہم ریڈیو کے مشاعروں کو نظر انداز نہیں کر سکتے بلکہ اسے اور زیادہ مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔'' [۲]

مذکورہ بالا عناوین کے علاہ اور بھی کئی عنوانات پر پروگرام نشر کئے گئے جس کو بسبب طوالت یہاں پر ذکر نہیں کیا جارہا ہے مثلاً ریڈیو ٹاک، خاکے، تجزیے، ڈاکومینٹری، اشتہارات وغیرہ ہیں۔ ادبی پروگراموں کے علاوہ الکٹرانک میڈیا کا سب سے طاقتور ہتھیار خبریں ہیں۔ اگر یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ الکٹرانک میڈیا کا آغاز ہی خبروں کی ترسیل کے لئے ہوا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو سے خبروں کی نشریات کا آغاز، روز اول سے ہی ہو رہا ہے۔ ابتدا میں ریڈیو کی زبان عموماً اردو ہی ہوا کرتی تھی اس وجہ سے زیادہ تر خبروں کے نشریات اردو زبان میں ہی ہوتے تھے۔ لیکن آزادی کے بعد ہندی اردو میں تخصیص ہونی شروع ہوگئی جس کا اثر بعد میں نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر شکیل اختر نے اپنی کتاب ''اردو میں نشریاتی ادب'' میں 19 اسٹیشن کے نام دیئے جہاں سے اردو میں خبریں نشر ہوتی ہیں۔

آل انڈیا ریڈیو سے ہٹ کر جس ریڈیو اسٹیشن کو مقبولیت حاصل ہوئی وہ ریڈیو سیلون ہے۔ اس اسٹیشن کی مقبولیت کی سب سے اہم وجہ اس سے نشر ہونے والا پروگرام ''بنا کا گیت مالا'' ہے۔ جس

کے میزبان عالمی شہرت یافتہ براڈ کاسٹر امین سایانی تھے جن کی آواز اور اردو کے شیریں الفاظ اس پروگرام کو کافی مقبول کیا۔ ڈاکٹر حسام الدین فاروقی اپنی کتاب ''اردو زبان کے فروغ میں ریڈیو، ٹیلی ویژن کا حصہ'' میں لکھتے ہیں کہ

''ریڈیو سیلون کے کمرشیل پروگراموں میں ''بنا کا گیت مالا'' پروگرام کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، جسے شہرت یافتہ امین سایانی نے 70-1960 کی دہائی میں بہت مقبول کیا اور خود بھی مقبول ہوئے۔ لیکن خاص بات یہ کہ امین سایانی نے بنا کا گیت مالا کو پیش کرتے وقت اردو کا بہت خوب استعمال کیا۔ خود امین سایانی کی آواز کے علاوہ ان کی استعمال کی ہوئی اردو زبان ''بنا کا پروگرام'' کی شہرت کی ضامن بنی۔'' ۳

الکٹرانک میڈیا کا دوسرا اہم جز ٹیلی ویژن ہے۔ ٹیلی ویژن کی ایجاد پہلی جنگ عظیم کے بعد جان لوگی برڈ کے ذریعہ ہوئی تھی۔ ہمارے ملک میں ٹیلی ویژن 1959ء میں پہنچ چکا تھا لیکن عوام کی دسترس میں یہ 80 کے دہائی میں آیا۔ ٹیلی ویژن کی ایجاد الکٹرانک میڈیا میں بہت بڑا انقلاب تھا اس آلہ کے ذریعہ سینما اور ریڈیو کو یکجا کر دیا گیا۔ آج کوئی گھر ٹیلی ویژن سے محروم نہیں ملے گا۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ جس طرح ریڈیو کے ذریعہ اردو زبان و ادب کا فروغ ہوا ٹیلی ویژن سے اُس کے ابتدائی دنوں میں خاطر خواہ نہیں ہوا۔

دوردرشن ابتدا میں خبروں، فلموں اور فلمی نغموں کی وجہ سے شہرت حاصل کی تھی پھر دھیرے دھیرے اس پر ہفتہ واری سیریلوں کا آغاز ہوا جس کا پہلا سیریل تھا ''ہم لوگ'' اسی طرح کئی اور پروگرام اور سیریل بھی نشر ہونے لگے۔ یوں تو پروگراموں کے ناموں اور پروگراموں کے اسکرپٹ میں اردو الفاظ کا غلبہ ہوتا ہے لیکن پھر بھی وہ ہندی پروگرام ہی کہلاتے ہیں۔

دوردرشن پر وقفہ وقفہ سے کچھ ایسے سیریل بھی پیش کئے گئے جو کہ خالص اردو میں تھے۔ جن میں سیریل مرزا غالب، ملا نصر الدین، علی بابا چالیس چور، کہکشاں، گل گلشن گلفام، حاتم طائی، ٹیپو سلطان قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ تمام سیریلس مخصوص کرداروں پر مبنی تھے جن کا کہیں نہ کہیں مسلم تہذیب سے تعلق تھا۔ ان کے علاوہ دوردرشن کیندر حیدرآباد سے ہفتہ واری اردو پروگرام انجمن کا آغاز کیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ حیدرآباد، دلی، لکھنؤ اور بھوپال سے اردو بلٹن بھی نشر کئے جاتے ہیں۔

ٹیلی ویژن پر اردو کا سنہری دور 2000ء سے شروع ہوتا ہے جبکہ ٹیلی ویژن کے نجی کاری کا آغاز ہوا۔ ان کئی نجی چینلوں میں ایک چینل ای ٹی وی اردو بھی تھا جس کو راموجی راؤ نے شروع کیا تھا۔ اس چینل کے ذریعہ اردو زبان و ادب کا بہت فروغ ہوا۔ یہ چینل 24 گھنٹے کی اساس پر چلنے والا اردو کا پہلا چینل تھا۔ اس چینل پر دن بھر میں وقفہ وقفہ سے خبروں کے ساتھ ساتھ مختلف پروگرام بھی نشر کئے جاتے تھے۔ جن میں ناولوں پر مبنی سیریلس، ڈرامے، مباحثہ، مذاکرے اور مشاعرے شامل ہوتے تھے۔ سید احمد جیلانی کا غیر مطبوعہ ایم فل کا مقالہ ''راموجی نالج سنٹر میں مخزونہ اردو ریکارڈ کا اشاریہ'' میں تمام پروگراموں کی مکمل فہرست دی ہے۔ ای ٹی اردو سے اردو زبان خاص کر اردو مشاعروں کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ای ٹی وی اردو کی جگہ News18 اردو نے لے لی ہے اب یہ چینل صرف خبروں کے لیے مختص ہو چکا ہے جس پر اردو میں خبریں نشر ہوتی ہیں۔ جبکہ بروز اتوار اور پیر رات 9:30 بجے مشاعروں کی ریکارڈنگ نشر کی جاتی ہے اور بروز ہفتہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا خصوصی پروگرام ''اردو دنیا'' رات 8 بجے نشر کیا جاتا ہے جبکہ باقی تمام پروگرام جو ای ٹی وی اردو پر نشر ہوتے تھے اس کو بند کر دیا گیا ہے۔

سہارا انڈیا پریوار کی جانب سے 2004ء میں عالمی سمے کے نام سے 24 گھنٹے خبریں نشر کرنے والے چینل کا آغاز کیا گیا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا چینل ہے جس نے کارپوریٹ میڈیا ہوزیز کے طرز پر 24 گھنٹے اردو میں خبریں نشر کرتا تھا لیکن اب یہ دکھائی نہیں دیتا۔

2010ء میں زی میڈیا گروپ نے زی سلام کے نام

سے ایک اردو چینل کی شروعات کی ہے اس میں زیادہ تر وقت خبروں، دینی پروگراموں کے لیے مختص ہے درمیان میں آدھے گھنٹہ کا جشن مشاعرہ اور آدھے گھنٹہ کا جشن صوفی (محفل سماع) کا پروگرام نشر کیا جاتا ہے۔

اردو ٹیلی ویژن چینلوں میں ایک اور چینل کا اضافہ 15 اگست 2006ء کو دور درشن اردو (ڈی ڈی اردو) کے نام سے شروع ہوا۔ اردو زبان وادب کے لئے ٹیلی ویژن کی دنیا میں یہ ایک تاریخی دن تھا۔ ملک میں ٹیلی ویژن کے آغاز کے تقریباً 50 سال بعد اردو کو اس کا حق ملا۔ اس چینل کے تعلق سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ مکمل چینل ہے جس میں خبریں، مذہبی پروگرام، موسیقی، ادبی پروگرام، تجزیے، انٹرویو، ڈاکومینٹری، صحت کے پروگرام اور باورچی خانے کے پروگرام اردو میں نشر کئے جاتے ہیں۔ ان بڑے بینر والے ٹی وی چینلوں کے علاوہ مقامی سطح پر کئی اردو چینل کارکرد ہیں۔

الکٹرنک میڈیا میں سب سے بڑا انقلاب جو 20 ویں صدی کے آخری ربع میں رونما ہوا وہ انٹرنٹ کا تھا۔ اس انٹرنٹ کے انقلاب نے دنیا کو عالمی دیہات میں تبدیل کردیا۔ انٹرنٹ کا انقلاب زندگی کے ہر شعبہ حیات میں اپنا پنجہ گاڑ چکا ہے۔ اب انٹرنٹ کے بنا زندگی بے معنی سی لگتی ہے۔ اس انقلاب نے لٹریچر پر بھی اپنا اثر قائم کیا ہے۔ اس اثر کو اردو زبان وادب نے بھی خندہ پیشانی سے قبول کیا ہے۔ آج اردو زبان وادب سے وابستہ افراد بھی انٹرنٹ سے بھرپور استفادہ کررہے ہیں W W W یعنی ورلڈ وائڈ ویب کے ذریعہ بے شمار اردو کی ویب سائیٹ تیار کی گئی ہیں۔ لیکن 21 ویں صدی میں دنیا ویب سائیٹ سے آگے نکل چکی ہے اب سوشیل میڈیا کا دور دورہ ہے۔ سوشیل میڈیا رئیلانس کے slogan ''کرلو دنیا مٹھی میں'' کے مانند ہے۔ اس سے ہم یقیناً دنیا کو مٹھی میں کرسکتے ہیں۔ جس کی بہترین مثال عصر حاضر کے ایک بڑے شاعر راحت اندوری کی ہے جن کا کچھ دن قبل انتقال ہوا ہے۔ راحت اندوری گذشتہ کئی دہائیوں سے مشاعروں میں شرکت کررہے تھے لیکن جو شہرت ان کو سوشل میڈیا کے آغاز کے بعد ملی وہ اس سے قبل ان کے حصہ نہیں آئی تھی۔ ان کے کئی اشعار آج زبان زد خاص و عام ہیں مثلاً یہ شعر

صرف خنجر ہی نہیں آنکھوں میں پانی چاہیے
اے خدا دشمن بھی مجھ کو خاندانی چاہیے

راحت اندوری کے مطابق یہ شعر 30 تا 35 سال قبل لکھا گیا تھا۔ لیکن سوشیل میڈیا کی وجہ سے آج یہ شعر اپنی مقبولیت کے عروج پر پہنچ گیا ہے۔ آج سوشیل میڈیا کی طاقت اتنی بڑھ گئی ہے کہ قدیم سے قدیم چیزوں تک عوام کی رسائی ہوگئی ہے اور دنیا میں کئی سیاسی وسماجی انقلابات اس نے برپا کئے ہیں۔

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ الکٹرانک میڈیا کے ذریعہ اردو زبان وادب کا فروغ بہت ہوا ہے۔ خاص کر ریڈیو نے اردو زبان وادب کے فروغ میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے ابتدائی دنوں میں تمام کے تمام پروگرام اردو ہی میں ہوا کرتے تھے۔ جب ٹیلی ویژن کا دور آیا تو اس کے ذریعہ بھی اردو کی آبیاری ہوئی لیکن خاص اردو کے بینر تلے نہیں ہوئی۔ ٹیلی ویژن کی نجی کاری کے بعد ارادتاً یا غیر ارادتاً اردو زبان کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ نجی چینلیں اپنے چینلوں پر پیش ہونے والے ڈراموں اور سیریلوں میں اردو زبان میں موجود شیرینی اور عوامی رابطے کی قوت کا بھرپور استعمال کررہے ہیں۔ آج ماس میڈیا کا ایسا کوئی شعبہ نہیں ہے جو اس عوامی رابطے کی زبان سے استفادہ نہیں کررہا ہو۔ ڈاکٹر جاوید کمال نے اپنی کتاب ٹیلی ویژن سیریلس (اردو زبان وتہذیب کے آئینہ میں) میں ایک ایک لفظ کا تجزیہ کرتے ہوئے تفصیل کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ کس طرح سریلس اور ٹی وی اشتہارات میں اردو الفاظ اور تراکیب کا استعمال ہوتا ہے۔

انٹرنٹ اور سوشیل میڈیا نے اردو کے لئے بہت ہی زرخیز زمین فراہم کی ہے۔ ہم اردو داں حضرات اس پلیٹ فارم سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے اردو کے وقار کو پھر سے سربلندی عطا کرسکتے ہیں۔ آنے والے 10 تا 20 سالوں میں سوشیل میڈیا اور ترقی کے مدارج.....(بقیہ ص:۱۲ پر)

طلعت صدیقی۔ ریسرچ اسکالر بنارس ہندو یونیورسٹی (یوپی)

آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں کے ادوار: ایک نظر

عالمی ادب میں ڈراما کی روایت بہت پرانی ہے۔ فنی اور صنفی دونوں لحاظ سے ڈراما ابتدا سے ہی عوام کی دلچسپی کا موضوع رہا ہے۔ اس کا شمار فنون لطیفہ کی قدیم ترین شکلوں میں ہوتا ہے اور موجودہ دور میں بھی اس کی مقبولیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ اس میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے۔

ڈراما ایک سنجیدہ اور پیچیدہ فن سمجھا جاتا ہے۔ جس کی تکمیل مصنف، اداکار، ہدایت کار کی مشترکہ کوششوں و کاوشوں سے ہوتی ہے۔ ڈرامے کی تاریخ کا اگر ہم مطالعہ کریں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اس کی تاریخ تقریباً دو ہزار سال پرانی ہے۔ لیکن اگر اردو ڈرامے کی بات کریں تو اس کی تاریخ صرف ایک صدی کو محیط ہے۔ ہمارے اردو ڈرامے کی عمارت جن مشاہیر نے تعمیر کی ان میں امانت، رونق بنارسی، طالب بنارسی، حسین میاں، احسن بے تاب وغیرہ ہیں۔ لیکن ان تمام مشاہیر میں آغا حشر کا نام سرِ فہرست ہے، ادبی معنوں میں ڈرامے کا آغاز آغا حشر کاشمیری سے ہوتا ہے۔ ان کے یہاں پہلی بار فن کے مطالبات کی طرف بھرپور توجہ دی گئی ہے۔

یوں تو آغا حشر نے دوسرے فن میں بھی طبع آزمائی کی لیکن ان کے فکر و فن کی جلوہ گری نے انھیں اردو ڈرامے کی شناخت بنا دیا۔ جو اردو ادب میں ان کی انفرادیت کو نمایاں کرتا ہے۔ شروع میں انھیں ڈراما لکھنے کا شوق تھا اور وقتاً فوقتاً بنارس میں کھیلے جانے والے ڈرامے ان کی توجہ کے مرکز رہے کچھ ڈرامے دیکھنے کے بعد حشر کے دل میں ڈراما نگاری کا خیال پیدا ہوا اور حشر نے اپنا پہلا ڈراما "آفتاب محبت" لکھا۔ یہ ڈراما جواہر اکبر پریس بنارس سے شائع ہوا اور بہت مقبول ہوا۔ اس وقت آغا حشر کی عمر صرف ۱۸ سال تھی۔

حشر قیام ممبئی کے دوران کاوس جی پالن جی کھٹاؤ کی پارسی تھیٹریکل کمپنی سے وابستہ ہوئے۔ دراصل حشر کی ڈرامہ نگاری کا باقاعدہ آغاز یہیں سے ہوا۔ آغا حشر کے اردو ڈراموں میں خواب ہستی خوبصورت بلا، اسیر حرص، مرید شک، شہید ناز، سفید خون، یہودی کی لڑکی، رستم سہراب، ترکی حور وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے متعدد ہندی ڈرامے بھی لکھے جس میں سیتا بن باس، بھیشم پرتگیا، آنکھ کا نشہ، مدھر مرلی، بھگیرت، گنگا وغیرہ بہت مشہور ہوئے۔

جہاں تک فن کا سوال ہے ان کے ڈرامے ڈرامہ کے جدید تقاضوں کو بخوبی پورا کرتے ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے حشر نے اپنے ڈراموں میں زندگی کے حقائق اور عام معاشرتی مسائل کو نہایت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اپنے بہترین طبع زاد ڈراموں کے تخلیق کار ہونے کے ساتھ وہ ایک بلند پایہ مترجم بھی تھے۔ حشر نے شیکسپیر اور دیگر غیر ملکی ڈراما نویسوں کے ڈراموں کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ بعض کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ ہر زبان کی نثر کا مزاج جداگانہ ہوتا ہے اس لئے کسی نثر کی اصل روح کو دوسری زبان میں منتقل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن آغا حشر نے اس مشکل مرحلے کو بھی بہ حسن خوبی انجام دیا کہ ان کے بعض ترجمہ کئے ہوئے ڈرامے بھی اردو نثر کی اصل روح معلوم ہوتے ہیں۔ "سلور کنگ" عرف نیک پروین اردو میں ترجمہ ڈراما خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس دور میں جب آغا حشر نے تھیٹر کی دنیا میں قدم رکھا اور آتے ہی اپنے ایک ڈرامے کے کردار سیزر کی طرح سب پر چھا گئے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ شیکسپیر کی روح کو اپنانے میں مکمل طور پر کامیاب رہے البتہ ان کے پاس ڈرامائی

آہنگ برتنے کا قدرتی ملکہ، فنی مہارت اور پلاٹ کی بنت کا ہنر موجود تھا جو شیکسپیر کو ڈھالنے میں بہت کام آیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے کاؤس جی تھیٹر کمپنی کے لیے 'بزم فانی (رومیو جولیت)، مار آستین، (اوتھیلو) 'مرید شک (ونٹر ٹیل)، شہید ناز (کنگ جان) اور اردشیر دادا بھائی کے لیے 'سفید خون' (میژر رفار میژر) اور خواب ہستی (میکبتھ) تحریر کیے جو اس قدر مقبول ہوئے کہ آغا حشر کا نام ہندوستان کے بچے بچے کی زبان پر چڑھ گیا۔ ان کی مقبولیت کا احوال چراغ حسن حسرت نے کچھ یوں بیان کیا ہے:

''ابھی ہندوستان میں فلموں کا رواج نہیں تھا۔ جو کچھ تھا تھیٹر ہی تھیٹر تھا۔ اور اس دنیا میں آغا حشر کا طوطی بول رہا تھا۔ یوں تو اور بھی اچھے اچھے ڈراماٹسٹ موجود تھے، احسن، بیتاب، طالب، مسائل سب کے سب ناٹک کی لنکا کے باون گذرے تھے، لیکن آغا کے سامنے بونے معلوم ہوتے تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ آغا سے پہلے اس فن کی قدر بھی کیا تھی، بچارے ڈراماٹسٹ تھیٹرک منشی کہلاتے تھے۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ آغا کو ہندوستان کے شیکسپیر کا خطاب دے دیا گیا۔ انھیں خود بھی یہ لقب پسند تھا، چنانچہ انھوں نے جب 1912ء میں اپنی ڈراما کمپنی کا آغاز کیا تو اس کا نام انڈین شکسپیر تھیٹریکل کمپنی رکھا۔

آغا حشر کو ڈرامے سے ذہنی لگاؤ اور طبعی مناسبت تھی ان کے دوران تعلیم بنارس میں الفریڈ کمپنی پہنچی۔ اس زمانے میں ڈرامے کی دنیا میں میر حسن احسن لکھنوی کا بڑا شہرہ تھا۔ حشر بھی کھیل دیکھنے جاتے تھے چنانچہ ان کی سوئی ہوئی صلاحتیں جاگ اٹھیں اور انھوں نے آفتاب محبت کے نام سے اپنا پہلا ڈرامہ لکھا۔ گویا ان کی ڈراما نگاری کے سفر کا یہ آغاز تھا۔ آغا حشر نے اپنے معاصرین سے اکتساب فیض ضرور کیا ہے۔ دورِ اولین کے ڈراموں پر قدامت کی چھاپ بہ آسانی دیکھی جاسکتی ہے بہ قول سیدہ جعفر:

''امانت کے دور سے لے کر آغا حشر کے زمانے تک ڈرامے نے جو ارتقائی منزلیں طے کی تھیں ان کے نقوش ان ڈراموں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ برجستہ گوئی، بدیہہ گوئی، فقرہ بازی، خطابت، شاعری کا جادو، بے جا استعمال گانوں کی کثرت اور مکالموں میں مسجع اور قافیے کا التزام طالب بنارسی، بیتاب اور احسن لکھنوی کے ڈراموں کی طرح آغا حشر کے ابتدائی ڈراموں میں بھی موجود ہے۔ مکالمے نثر میں ہونے کے باوجود قافیوں کے استعمال میں تصنع پیدا کر دیا ہے اور ان کی فطری بیساختگی اور روانی مجروح ہوگئی ہے۔ آغا حشر کے ڈراموں میں اس کی مثالیں اکثر جگہ مل جاتی ہیں''۔

آغا حشر کی ڈراما نگاری کا فن ارتقائی مرحلے سے گذرا ہے۔ اپنے ابتدائی دور میں نہ وہ وسعت مطالعہ ہے اور نا پختگی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بنارس اور اطراف جوانب وہ ماحول میسر نہ تھے جس کا شدید احساس خود حشر کو تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ بنارس میں رہ کر نہ تو فن تمثیل نگاری کی خدمت کر سکتے تھے اور نہ اپنے طبعی رجحان اور جذبے کی تکمیل کر سکتے تھے۔ دوسرے اس زمانے میں شرفا ڈراما دیکھنا نہ پسند کرتے تھے اور نہ اس محفل میں شرکت کرنا۔ تیسرے ڈراما کو ادبی اور علمی کام نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے حشر اپنی صلاحیتیں بروئے کار لانے کے لئے بنارس چھوڑ کر بمبئی چلے گئے۔ بمبئی میں کاؤس جی کھٹاؤ نے ۵۳ روپے ماہانہ پر آغا صاحب کو اپنی کمپنی میں ملازم رکھ لیا۔ یہ آغا حشر کی تمثیل نگاری کا سنگ بنیاد تھا۔ اس کے بعد انھوں نے اردشیر دادا بھائی ٹھونٹی کی کمپنی میں ملازمت کی۔ کچھ عرصہ الفریڈ تھیٹریکل کمپنی سے وابستہ رہے۔ نیو الفریڈ تھیٹریکل کمپنی کے تو وہ خاص ڈراما نگار تھے۔ حشر کے ڈرامے پارسی اسٹیج پر عرصہ دراز تک کھیلے جاتے رہے جس سے حشر کی شہرت میں چار چاند لگ گئے اور کمپنیوں کو بھی خوب مالی فائدہ ہوا۔ حشر نے اپنی ایک کمپنی حیدر آباد میں قائم کی لیکن یہ بند ہوگئی۔ اس کے بعد لاہور میں اپنی دوسری کمپنی ''انڈین شیکسپیر تھیٹریکل کمپنی'' کے نام سے بنائی لیکن کچھ عرصہ بعد یہ کمپنی بھی بند ہوگئی۔ ۱۹۱۴ء میں آغا حشر کی رفیق حیات کا انتقال

لاہور میں ہو گیا۔ ناساز گار حالت کی وجہ سے وہ کلکتہ چلے گئے۔ اس دوران حشر نے زیادہ تر ہندی میں ڈرامے لکھے۔ ۱۹۲۸ء میں جب یہ کمپنی امرتر آئی تو آغا حشر کے ڈراموں ''آنکھ کا نشہ، ترکی حور'' اور یہودی کی لڑکی'' نے ایک دھوم مچادی۔

حشر جب دوبارہ کلکتہ پہنچے تو ڈراما کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔ متکلم فلموں نے تھیٹروں کا بازار بالکل سرد کر دیا تھا۔ آغا صاحب نے ''شیریں فرہاد'' کے بعد ''عورت کا پیار'' لکھ کر ہندوستانی فلموں میں قابل قدر اضافہ کیا۔ شیریں فرہاد اور عورت کا پیار کے علاوہ حشر نے ''یہودی کی لڑکی'' ''قسمت کا شکار'' ''چنڈی داس'' ''دل کی آگ'' ''شہید فرض''، بلوا منگل'' لوکُش''، رستم وسہراب اور بھیشم پتاما'' فلمی ڈرامے لکھے''۔

آغا حشر 32 یا 33 سال تک ڈرامے کی خدمت کرتے رہے۔ انھوں نے بیک وقت اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ڈرامے لکھ کر اپنی فن کارانہ صلاحیت اور زبان دانی کا لوہا منوالیا۔ آغا جمیل صاحب نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ اردو ہندی ڈراموں کے علاوہ 1922ء میں اسٹار تھیٹریکل کمپنی کلکتہ کے لیے دو ڈرامے ''اپرادھی کے اور ''مصر کماری'' بنگلہ زبان میں آغا صاحب نے لکھے تھے جو بہت مقبول ہوئے۔ بیتاب بنارسی نے آغا حشر کو ہندی میں ''بلوا منگل (سورداس)، بن دیوی عرف ''بھارت رمنی'' لکھ کر بیتاب کا منہ بند کر دیا۔ ''مدھر مرلی''، آنکھ کا نشہ، بھگیرت گنگا، ''سیتا بن باس'' اور بھیشم پرتگیا'' کے سامنے تو بیتاب نے ہندی ڈراموں کی شہرت ماند پڑ گئی۔

حشر کے چند ڈرامے ایسے ہیں جو قدیم ہندوستانی تہذیب و معاشرت اور ہندو دیو مالا یعنی رامائن اور مہابھارت کے قصوں پر مبنی ہیں۔ جیسے بلوا منگل عرف سورداس، بن دیوی مدھر مرلی، سیتا بن باس اور بھیشم پرتکیا وغیرہ۔ ان ڈراموں کی زبان زیادہ تر ہندی ہے۔ ان کے علاوہ کچھ ڈرامے ایسے ہی معاشرتی، اصلاحی اور سیاسی موضوعات سے متعلق ہیں جیسے ''خوبصورت بلا''، ''ترکی حور''، ''ٹھنڈی آگ''، ''آنکھ کا نشہ''، ''پہلا پیار''، ''بھارتی بالک عرف سماج کا شکار''، ''دل کی پیاس'' اور رستم وسہراب وغیرہ۔

فن تمثیل نگاری میں حشر کی تدریجی ارتقا ان کی فنی بصیرت ادبی عظمت اور مقام و مرتبے کو سمجھنے اور متعین کرنے کے لیے ان کے ڈراموں کو عموماً چار ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ ہر اگلا دور حشر کے فن کی بعض نئی خصوصیات کا حامل ہے۔ حشر نے جب اپنی ڈراما نگاری کا آغاز کیا تو اس دور میں مالکانِ کمپنی اور عوام کی پسند کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ بدیہہ گوئی، فقرہ بازی، اور برجستہ گوئی، اشعار کی بھرمار، مقفّی اور مسجع عبارت، گانوں کی کثرت، خطابت کا زور اور جذبات کا طوفان، ڈرامے کے لوازم اور اس کی کامیابی کی ضمانت سمجھے جاتے تھے۔ اندر سبھا کی روایت کا اثر غالب تھا۔ اسٹیج پر منشی رونق بنارسی، حافظ عبداللہ، نظیر بیگ حسینی میاں ظریف اور ان کے بعد طالب، احسن، اور بیتاب کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ ابتدائی دور میں حشر نے ان تمام باتوں کو اپنایا ''مرید شک''، ''مارِ آستین'' اور اسیر حرص اسی دور کی عکاسی کرتے ہیں۔

دوسرے دور میں حشر نے ڈرامے کی چند روایات کو برقرار رکھا۔ قافیہ کا التزام، خطابت کے زور کے ساتھ ساتھ مکالموں میں بلند آہنگی ہے لیکن اشعار اور گانوں میں کچھ کمی نظر آتی ہے۔ حشر اپنی خداداد صلاحیت، سماجی شعور اور فنی کاریگری کا مظاہرہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے فقروں سے ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے میں بڑی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ ''سفید خون'' میں حشر نے قافیہ کے استعمال سے عمل میں زور، کردار کی ذہنیت کو ابھارنے اور ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کا کام لیا ہے۔ حشر کے ڈراموں میں کرداروں زبان مقفّی اور مرصع ہے اور مکالموں کو مزید موثر بنانے کے لیے حشر نے اپنے اشعار کو بھی شامل کیا ہے۔ اس عہد کے ڈراموں میں ''صید ہوس''، ''سفید خون'' اور شہید ناز'' کامیاب ڈرامے ہیں۔

تیسرا دور حشر کے فنی ارتقا کا دور ہے۔ حشر نے اس عہد میں ڈرامے کی دیرینہ روایت سے ہٹ کر اسے نئے سلیقے

سے آراستہ کیا اور اسے نئی پہچان دی۔ ڈرامے کو تہذیب ومعاشرت سے متعلق اصلاحی مقصد کا ترجمان بنایا۔ جمیل جالبی صاحب نے صحیح کہا ہے کہ:

''آغا حشر نے ڈرامے کو بلند کیا۔ اس میں معاشرتی اور اصلاحی پہلو بھی اجاگر کیے اور ڈرامے کے ذریعے سیاسی اور اصلاحی روایت کو ہمارے مزاج میں شامل کیا۔ ہمیں ڈرامے کے عملی معنی سمجھائے۔ ہمیں ڈراما پیش کرنے اور دیکھنے کا سلیقہ دیا''۔

اس دور میں حشر نے منقفی نثر اور بے سروپا موضوعات کی جگہ دقیانوسی اسٹیج پر معاشرتی، مذہبی اور اصلاحی موضاعات کو جگہ دی۔ اس دور کے ڈراموں میں نثر کا استعمال زیادہ ہے اشعار اور قافیے کا التزام صرف اس حد تک جائز رکھا ہے جو کرداروں کے مزاج اور ان کی شخصیت کا صحیح عکس معلوم ہو اور ناظرین میں عمل کی شدت اور جوش پیدا کر سکے۔ اس دور کے مشہور ڈرامے ''خواب ہستی''، ''خوبصورت بلا''، ''سلور لنگ''، ''ترکی حور''، ''یہودی کی لڑکی''، ''بلوا منگل'' اور ''آنکھ کا نشہ'' ہیں کہا جاتا ہے کہ ''آنکھ کا نشہ'' جب اسٹیج پر پیش کیا گیا تو ناظرین شراب کے تباہ کن اور عبرت انگیز نتائج سے خوفزدہ ہوئے کہ ان میں سے بہت لوگوں نے شراب نوشی ترک کردی۔

چوتھا دور حشر کی ڈراما نگاری کا آخری اور انتہائی اہم دور ہے۔ اس دور کو حشر کے فن کارانہ شعور کی پختگی اور ارتقائی عمل کا بہترین دور کہنا مناسب ہوگا۔ کرداروں کے مکالمے ان کی شخصیت کو ابھارنے، واقعات میں تاثیر پیدا کرنے اور عمل کو پراثر بنانے کا کام کرتے ہیں۔ اس دور کے ڈراموں میں نہ اشعار کی کثرت ہے نہ قافیہ کی جھنکار، گانوں کا استعمال بہت کم ہے یا بالکل نہیں ہے۔ حشر اپنے ڈراموں کے کردار اپنے دوستوں، آشناؤں اور ملاقاتیوں کے حلقے سے انتخاب کر لیتے تھے اور بعض اوقات ان کرداروں کو جنم دینے میں ان کے تخیل کی کارفرمائی ہوتی تھی۔ حشر نے چوں کہ سماج کے کسی نہ کسی طبقے نیز زندگی کے اہم مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس لیے ان کے یہاں بادشاہ، وزیر، بیگم، خادمہ، باغی غدار قوم، محب وطن، عصمت مآب اور وفادار بیویاں، جانثار ملازم، شرابی جواری، طوائف، ڈاکو اور قاتل غرض کہ ہر طرح کے کردار موجود ہیں۔ ان کے کرداروں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مصائب اور پریشانی ان میں احساس شکست پیدا کرنے کے بجائے ان میں ان مصائب سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ اور زندگی کی شمع روشن کرنے کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

اردو ڈرامے جو اسٹیج پر پیش کیے جاتے تھے ان کی ایک روایت یہ بھی چلی آرہی تھی کہ مزاحیہ حصہ (کامک) اصل کہانی سے الگ ہوتا تھا جس میں ظرافت کا معیار انتہائی پست ہوتا تھا۔ اس میں ابتذال، رکاکت، گالی گلوچ، دھول دھپا، اور پھکڑ بازی غرض کہ ساری وہ غیر معیاری حرکتیں ہوتی تھیں جو عوام کے گرے ہوئے تفریحی ذوق کی تسکین کا سامان مہیا کر سکیں۔ اپنے ابتدائی دور کے ڈراموں کے مذاحیہ حصوں میں حشر نے بھی اپنے یہاں اس عوامی بلکہ عامیانہ روش کو ملحوظ رکھا۔ لیکن بعد میں ان کے یہاں ایک صحت مند رجحانات ابھرتا نظر آتا ہے۔ وہ کامک کو بھی اصلاح معاشرہ کے لیے ذریعہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ حشر کے یہاں ہمیں ''کامک'' کے بارے میں تدریجی تبدیلی کے نشانات بھی ملتے ہیں چنانچہ ''ترکی حور'' اور ''بلوا منگل'' میں انھوں نے کامک کی مستقل حیثیت ختم کر کے اسے اصل کہانی کا جزو بنا کر پیش کیا ہے اور آخری دور کے ڈراموں میں تو انھوں نے مزاحیہ پلاٹ کو اپنے ڈراموں سے بالکل خارج کر دیا ہے۔

حشر کے فن تمثیل نگاری کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو انھوں نے عوام کی پسند اور ذوق کا خیال رکھا اور دوسری طرف ڈرامے کے فن کو بلندی اور جلا بخشنے کی بھرپور کوشش کی۔ انھوں نے اسٹیج کے لوازم وضروریات کا لحاظ بھی کیا اور ڈرامے میں سماجی اور اصلاحی موضوعات سمو کر اسے وسعت بخشی۔ ڈرامے کو روایتی پابندیوں سے آزاد بھی کیا اور اسے محض ایک تفریحی مشغلے کے درجے سے اوپر اٹھا کر سنجیدہ اور سبق آموز پہلوؤں کا ترجمان بنایا۔

نعمت النساء۔ ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

دکنی ادب کا مہتاب باقر آگاہ

اردو زبان اپنی ابتدائی نشو ونما سے خوش نصیب رہی ہے کہ اس کی آبیاری صوفی سنتوں اور شاہان وقت نے کی ہے۔ مرور زمانہ کے ساتھ اس زبان نے بھی کئی تغیرات کو دیکھا اور کئی لبادوں کے ساتھ زمانہ کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی رہی، اس کی سن پیدائش پر محققین کی مختلف آراء ہیں۔ جنوبی ہند میں گلبرگہ، بیدر، بیجاپور، گولکنڈہ، حیدرآباد اور نگ آباد میں دکنی ادب کے نام سے اردو پروان چڑھتی گئی، جیسا کہ دنیا کی بڑی زبانوں میں نثر سے پہلے منظوم شہ پارے منظر عام پر آئے۔ اس طرح اردو میں بھی نظم ہی کے نمونے اردو ادب کے طالب علم کو ملتے ہیں۔ زمانہ کے لیل ونہار کے ساتھ نظم اپنی مختلف اقسام میں بٹتی گئی، آغاز مثنویوں اور چکی ناموں سے ہوا، مثنویوں میں مشہور زمانہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ مثنوی کو اولین حیثیت حاصل ہے جو فخرالدین نظامی سے منسوب ہے، اسی طرح چکی ناموں کے محرک ومؤسس کی اولین شخصیت ہونے کا حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودرازؒ کو اعزاز حاصل ہوا۔

دکنی میں زبان وقلم نظم ہو کہ نثر چلانے والوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ ہر شخص نے اپنا بھرپور حصہ ادا کیا اور آنے والی نسل تک یہ قیمتی ورثہ پہنچاتے رہے۔ انہی میں ایک نمایاں اظہر من الشمس نام حضرت مولانا باقر آگاہ ویلوریؒ کا ہے۔

مولانا باقر آگاہ قادری ویلوریؒ اردو زبان کے ادیب اور صاحب دیوان شاعر ۱۱۵۸ھ میں پیدا ہوئے۔ جنہوں نے فقہ۔ عقائد۔ سیرت پر کئی ایک کتب تصنیف فرمائی۔

باقر آگاہ قادری نہ صرف عربی اور فارسی بلکہ دکنی زبان کے قادرالکلام شاعر تھے۔ جنہوں نے اپنی ساری زندگی تصنیف وتالیف بلکہ علمی وادبی ودینی خدمات میں گذاری۔ آگاہ ایک مستند محقق ومورخ، صوفی، معتبر، سیرت نگار اور بلند مرتبہ مبلغ قرآن وحدیث اور تعلیم نسواں کے محرک مانے جاتے ہیں۔ آگاہ کے کلام میں جابجا یہ پہلو نمایاں رہتا ہے۔ جہاں بھی آپ تعلیم یا اصلاحی موضوعات کو منتخب کرتے ہیں تو ضرور سلف صالحین کی منتخب شخصیات کو بطور تمثیل پیش کرتے ہیں۔

آگاہ نے اپنے کلام میں جہاں عورتوں کو تعلیم کی طرف ابھارا ہے۔ وہیں دیگر شعراء اور مصلحین اُمت سے اپنی امتیازی جھلک کچھ اس طرح سے نمایاں کیا ہے کہ صبح قیامت تک خواتین آپ کی مشکور رہیں گی۔ آگاہ نے خواتین کے لئے سہل انداز، سلیس زبان، بہترین اندازِ تکلم میں شانِ محمدیؐ، سیرت النبیؐ، شمائل نبویؐ، معجزات نبویؐ، آپؐ کے آداب، آپؐ سے محبت، آپؐ کی پیدائش گویا حیاتِ مبارکہ کے ہر گوشہ کو ضبط تحریر میں لانے کی بھرپور کوشش کی ہے اور اس میں صد فیصد کامیاب بھی رہے۔

دکنی لب ولہجہ اور اس کا ارتقاء آگاہ پر ہی ختم ہوگیا۔ آپ کے بعد دکن میں اتنا بڑا ادیب وشاعر پیدا نہ ہوسکا۔ اہل کمال نے ہمیشہ آگاہ کو بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ بلاتوقف تصانیف لکھتے رہے۔

شاعری کی اس بلندی پر ہونے کے باوجود آگاہ اپنے معاصر میرؔ وسوداؔ جیسی شہرت نہ پاسکے۔ اس دور میں دکنی کا رواج تھا کہ مثنویاں یا تو دکنی میں لکھی جاتیں یا ہندی میں۔ آگاہ نے ساری اردو تصانیف دکنی زبان میں تحریر فرمائی۔ اس کی ایک وجہ خواتین کا دکنی زبان پر عبور تھا۔ آگاہ کی جملہ تصانیف ۱۲ ہیں جو

اب تک ہم تک پہنچی ہیں۔

(۱) رسالہ عقائد
(۲) تحفۃ النساء
(۳) ہشت بہشت
(۴) محبوب القلوب
(۵) ریاض الجنان
(۶) تحفۃ الاحباب
(۷) فرائد در فوائد
(۸) گلزارِ عشق
(۹) روضۃ الاسلام
(۱۰) خمسہ متحیرہ اورج آگاہی
(۱۱) مثنوی روپ سنگار
(۱۲) دیوانِ ہندی

آگاہ کی تمام تصانیف میں زبان انتہائی سہل، رواں دواں، آمد آمد ہی ہے۔ آورد یا تکلف کا کہیں شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ آگاہ کی تصانیف کو ان کی حین حیات ہی شہرت تامہ حاصل ہو چکی تھی۔ آپ کی تصانیف ہر کتب خانے کی زینت اور ہر فرد کی پہلی پسند ہوتی۔ فہرست جہیز میں ضرور آگاہ کی تصانیف موجود ہوتیں۔ بعد میں جب پرنٹنگ پریس ایجاد ہوئے تو بارہا یہ طبع ہوتی رہیں بلکہ آج بھی اس کے مخطوطے بیسیوں لائبریوں و دیگر جگہ محفوظ ہیں۔ جس سے اس کی اہمیت وضرورت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آگاہ کے کلام کی خاصیت یہ ہے کہ ہر خاص وعام کے فہم کے مطابق ہے۔

رسالہ عقائد

رسالہ عقائد ۱۱۸۵ھ میں دکنی زبان میں آگاہ کی پہلی تصنیف ہے۔ عقائد اہل سنت۔ ایمانِ مفصل اور ایمانِ مجمل ۴۸۰ اشعار پر مشتمل تفصیلی تصنیف ہے۔ تخلیق انسانی کا مقصد اطاعتِ الٰہی ہے اور اطاعتِ الٰہی اسی وقت کارگر ہوگی جبکہ خلاق کائنات کی پہچان ہو۔ پہچان تب ہی ممکن ہے جب بندگی اور عبادت آخری زمرہ میں ہو۔ اس وقت اس کی عبادت و بندگی اطاعت کے حدود پار کر کے دمِ زندگی دم بندگی بن جاتی ہے۔

سمجھ رے گیاں کے دریا کے گوہر
کہ فرمایا ہے حق قرآن کے اندر
نہیں پیدا کیا میں انس وجاں کوں
مگر طاعت کریں میری یقین سوں
پچھانت اوسی کی طاعت سے اول
عبادت ہے پچھانت نہیں مکمل
پچھانت اوس کی اول فرض ہے جان
عبادت اس کی بعد از فرضی کر مان

تحفۃ النساء

آگاہ نے اپنے منظوم کلام کے ذریعہ جہاں بے شمار معاشرتی پہلوؤں کی اصلاح کے لیے قلم اٹھایا وہیں تعلیم اور اس کی اہمیت کو بہت ہی خوب انداز میں لڑکوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دلوائی۔ ایک جگہ کچھ اس طرح ارشاد فرماتے ہیں۔

جب لڑکا لڑکی ہوش پاویں
تو ماں باپ اوّل یہ سکھاویں
کہ سارے خلق کا اللہ ایک ہے
نہیں اس باب میں ذرہ برابر شک ہے

یہ مثنوی عورت کی تعلیم کے متعلق ہے ایک عورت کی تعلیم صرف ایک عورت کی نہیں بلکہ ایک خاندان، ایک سماج اور ایک معاشرہ کی تعلیم ہے۔ اس مثنوی میں برگزیدہ خواتین اسلام کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہ نسخہ کہ ہے عجیب ونادر
مخصوص ہے عورتاں کی خاطر
عورت کے واسطے بنا ہے
نام اس کا بھی تحفۃ النساء ہے

آگاہ کے کلام میں جا بجا یہ پہلو نمایاں رہتا ہے۔

جہاں بھی تعلیم یا اصلاحی موضوعات کو منتخب کرتے ہیں تو ضرور سلف صالحین کے مشہور شخصیات کو بطور تمثیل پیش کرتے ہیں۔ تحفۃ النساء میں جہاں آگاہ نے ۸۰۰ اشعار اپنی باقیات چھوڑا ہے اس میں بھی اُمت کی ان مایہ ناز شخصیات کو خوب خراج عقیدت پیش کیا ہے اور ہمیں ان کے اسوہ کو اختیار کرنے کی ترغیب دی ہے۔ آپ نے جہاں گیارہ صحابیات میں اُمہات المومنین و بناتِ رسولؐ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بطور خدمت رہنے والی کنیزوں رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور اُمت مسلمہ کے دیگر 14 مایہ ناز خواتین کو بطورِ نمایاں پیش کیا ہے۔

آگاہ نے اپنے کلام میں عورتوں کو جہاں تعلیم کی طرف ابھارا ہے وہیں دیگر شعراء اور مصلحین اُمت سے اپنی امتیازی جھلک کچھ اس طرح سے نمایاں کیا ہے کہ قرب خداوندی، تقرب الٰہی صرف مرد حضرات ہی کا حصہ نہیں بلکہ صبح قیامت تک خواتین کے لیے بھی حصول کے برابر مواقع فراہم ہیں۔

ہے حمد و ثناء اسے سزاوار
بخشش کو نہیں ہے جس کے کچھ بار
چاہے جسے قرب دے وے
عورت اچھے کہ مرد ہو رے
ہے فیض جگت پو عام اس کا
ہے عقل سے بھار کا اس کا
ہے احمد مصطفےٰ جب اکمل
اُمت بھی ہے اس کی سب سے افضل
اُمت میں نبی کے ہیں جو عورت
افضل ہیں سب عورتاں سے سن بات

ہشت بہشت

باقر آگاہ نے عورتوں اور عوام کے ذہنوں کو حالات کے مطابق بدلنے کا کام شروع کیا اور کچھ حد تک اس میں کامیاب بھی ہوئے اگر اردو میں ہشت بہشت نہ لکھتے تو خواتین پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ سے کما حقہ واقف نہ ہوتیں۔

یہ سیرت النبیؐ پر منظوم مثنوی 1185ھ سے 1206ھ کے درمیان لکھی گئی جو آٹھ حصوں پر مشتمل ہے۔ جس کا ہر حصہ نادر و نایاب ہے۔

1۔ من دیپک: جس میں نورِ محمدیؐ کا تذکرہ ہے۔ سن تالیف 1185ھ

2۔ من ہرن: نبوت کی شہادتوں کا بیان ہے۔

3۔ من موہن: اس مثنوی میں حضورؐ کی سنِ ولادت سے آٹھ سال تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔

رکھ اس نسخہ کا نام من موہن
کر وسیلہ تو اسے احمد کن
کر تو ہر مو کو اپنے موسیقار
اب ولادت کے اوس کے لکھ اخبار
حمل کے جو حکایتاں ہیں تمام
وضع کے جو کرامتاں ہیں تمام
دودھ کے سن میں جو ہو رہے عیاں
تا بہ سن تمیز اے حیراں

باقر آگاہ کی خاص بات یہ ہے کہ وہ غزل میں بھی اپنا تخلص استعمال کرتے ہیں۔

4۔ جگ موہن: رسول عربیؐ کے آٹھ سال سے وفات مبارکہ تک کے حالات ہیں۔

باقر اب کر کو دعا آخیر یہاں
لکھ تو احوال شہ گون و مکاں

لے کو ابوبکرؓ کو اپنے ہمراہ
گیا طیبہ کی طرف اے گاہ

5۔ آرام دل: اس میں اخلاق اور شمائل نبویؐ کا تذکرہ ہے۔

شمائل محمدؐ کا اے مہربان
ہے نازی میں اور فارسی میں بیان
نہ دکنی میں کہیں آیا نظر
مگر ایک رسالہ ہے کہ منتشر

6۔ راحتِ جان: حضور پرنورؐ کے خصائص کا بیان ہے۔

7۔ من درپن: معجزاتِ نبویؐ کا بیان سنِ تالیف 1206ھ ہے۔

8۔ من جیون: آپؐ کے آداب، آپؐ سے محبت، روضہ مبارکہ کی زیارت اور درود شریف کے فضائل بیان کیے گئے ہیں۔

محبوب القلوب

محبوب القلوب آگاہ کی تمام مثنویوں کی معراج ہے۔ جس کو آگاہ نے نہایت ہی عمدہ انداز میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جو اپنی معراج کو پہنچ گئی۔ اس میں آگاہ نے محبوب سبحانی غوث صمدانی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے احوال کو دکنی میں اس طرح پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا غوثِ پاکؒ کو اپنے سامنے پاتا ہے اور احوال اس طرح کہ بروئے کار لانے تک چین نہیں پاتا۔ یہ جملہ 4063 اشعار پر مشتمل ہے۔ محبوب سبحانیؒ سے جنوبی ہند کے لوگ بڑے ہی عقیدت واحترام اور گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ بڑی ہی دھوم دھام سے گیارہوں کی محفلیں سجائی جاتی ہیں۔ گیارہ دن محبوب القلوب کے گیارہ باب پڑھے جاتے ہیں۔ بعد میں حسب حیثیت تناول طعام کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ امیر غریب، گورا کالا غرض ہر خاص وعام کو تبرک کھلایا جاتا ہے۔

عنایت کر کے ہم کون یہ تمامی
دیا توں ہم کون ایسے کی غلامی
کہ سلک آل کا وہ واسطہ ہے
امامت سے جسے نت رابطہ ہے
دیا سب اولیاء پہ اوسے راج
کیاں جوں انبیاء اوس کو سر تاج

حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مدح میں دو قصیدے اور بھی ہیں پہلا آسان اور بے تکلف زبان میں لکھا گیا ہے۔ جس میں کافی ہندی الفاظ کا استعمال ہوا ہے۔

لکھا نہیں مثنوی میں جو کرامات
یاں کہتا ہوں کچھ تلمیح کے سات
اور اس میں حال اپنا بولتا ہوں
گرہ طالع کی اپنے کھولتا ہوں

پھر قصیدہ کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

پڑا ہوں واسطہ اندوہ محبت میں بحیرانی
میری دستگیری کر لوا ے محبوب سبحانی
لیا ہے گھیر حیرت کا اندھیرا یوں میرے دل کو
کہ میرا روز روشن ہو گیا دیجور ظلمانی
میری تاریک شب ہوگی پنم کے چاند سے تاباں
دکھادے گا اگر جلوہ تیرا مہر نورانی

آگاہ نے کافی محنت ومشقت سے نہایت ہی سادہ زبان میں یہ مثنوی کو اپنے زورِ قلم سے جان ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ خود کہتے ہیں زبان جیسی بھی ہو مقصد احوالِ اولیاء ہے۔

لکھا ہوں صاف یہ نظر اے برادر
کہ ہے کام رمیوں سے اس میں اکثر
لطافت شعر کی وہ جانتے نہیں
نزاکت اس کی کچھ پہچانتے نہیں

ریاض الجناں

ہے ریاض الجناں اس کا نام
اس سے آ کہ دلوں کو ہے آرام

اس مثنوی کا موضوع اختصار کے ساتھ اہل بیت اطہارؓ ہے۔ آگاہ نے جہاں بھی قلم اٹھایا وہاں پر نادر ونایاب اور انمول موتیوں کو بکھیرا۔ اپنی موتیوں میں نمایاں طور پر ریاض الجناں ہمارے اور آپ کے درمیان چھوڑا ہے۔ اس مثنوی میں آگاہ نے سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا کام کیا ہے۔ اہل بیت

اطہارؓ کی محبت جز ایمان ہے۔ آگاہ نے اس طرف ہماری اور آپ کی نظر مبذول کروائی ہے۔

سن تو یہ بات اے رفیق شفیق
دیوے مولا مجھے تجھے توفیق
کہ محبت نبی ہے جوں فرض
الفت اس کی ہے آل جو فرض
ہے دلیل اوس کی بھی قرآنی
اور احادیث بہوت اے گیانی

تحفۃ الاحباب در مناقب الاصحابؓ

نام اس کا تحفۃ الاحباب ہے
مومن جان اولی الالباب ہے

تحفۃ الاحباب میں ذرا سا پہلو تہی کرتے ہوئے آگاہ نے کتاب کے عنوان کی اہمیت کے پیش نظر نثری دیباچہ بھی لکھا جس میں نصوص قرآنی واحادیث نبویؐ بطور استدلال کئی دلائل پیش کیا۔ اس میں آگاہ نے اپنے مسلک اہل السنۃ والجماعت کو ببانگ دہل ظاہر کیا ہے۔ جہاں عشق اہل بیتؓ مومن کے لیے فرض ہے۔ وہیں محبت صحابہؓ بھی عین ایمان ہے۔ اہل بیتؓ مانند کشتی ہے تو صحابہؓ سمندر میں چلنے والی کشتی کے لیے بطور تارہ منزل ہدایت تک پہنچنے کا ناقابل فراموش ذریعہ ہے۔ آگاہ نے اپنی اس مثنوی میں یار غار صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ، عثمان ذوالنورینؓ، حیدر کرارؓ، عمانِ محترم حضرت حمزہؓ و حضرت عباسؓ اور باقی چھ اصحاب مبشراتؓ کے تذکروں اور ان کے کارناموں کو اُمت کے سامنے بھرپور خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے نمایاں کارناموں کو اجاگر کیا ہے۔

اور چند ایک مثنویاں فرائد در فوائد، گلزارِ عشق، روضۃ الاسلام اور خمسہ متحیرہ اوج آگاہ ہیں۔

یوں تو سبھی نثری دیباچے اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں تاہم تحقیقی، تنقیدی، لسانی اور علمی نقطہ نظر سے گلزارِ عشق اور دیوانِ ہندی کے دیباچہ غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔

شاہ نوازا ہاشمی۔ حیدرآباد

غزل

میں سوچتا ہی رہا اب ملے گا پیار مجھے
ملے ہیں پھول کے بدلے میں پھر بھی خار مجھے

تمہاری تُرش روی نے دُکھا دیا دل کو
یہی طریقہ تمہارا ہے ناگوار مجھے

دلوں میں کینہ ہے چہرے پہ مسکراہٹ ہے
کسی پہ بھی نہ رہا آج اعتبار مجھے

ہے نفرتوں کا یہ بازار آج چاروں طرف
ٹٹولتا ہوں سبھی کو ملے گا پیار مجھے

خزاں کے خار میں اُلجھا ہے پیرہن میرا
"پکارتا ہی رہا موسم بہار مجھے"

سکوں ملے مجھے دنیا میں ماں کے آنچل سا
لگے کوئی تو شجر آج سایہ دار مجھے

وسیم بیگم ریسرچ اسکالر یونیورسٹی آف حیدرآباد

اُردو ادب میں انشائیہ کا ارتقائی سفر

انشائیہ دراصل عربی لفظ ہے جو لفظ ''انشا'' سے مشتق ہے جس کے معنی عبارت آرائی، کوئی بات دل سے پیدا کرنا، طرز تحریر یا وہ کتاب جس میں خط و کتاب کے قواعد اور خطوط لکھے ہوں۔ فیروز اللغات میں انشائیہ کے معنی کچھ اس طرح ہے۔

''نحو کی اصطلاح میں وہ جملہ جس میں سچ وجھوٹ کا احتمال نہ ہو''

(فیروز اللغات الحاج مولوی فیروز الدین ص ۱۳۱)

اصطلاحی معنوں میں ادب کی ایک صنف سخن ہے جس کو ایسے بھی کہا جاتا ہے۔ ''ایسے'' اوسط لمبائی کا ایک ایسا مضمون ہے جو عموماً نثر میں ہوتا ہے۔ اور جس میں سہل اور سرسری انداز میں کسی موضوع پر مضمون لکھا جاتا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو صرف اس موضوع سے بحث کی جاتی ہے جو لکھنے والے کو متاثر کرتا ہے۔

صنف انشائیہ کا آغاز فرانس میں اس وقت ہوا جب مونٹین نام کا ایک ادیب، جسے انشائیہ کا موجد اور باوا آدم کہا جاتا ہے۔ غیر افسانوی نثر کو ایک نئے انداز سے اپنے اظہار خیال کو پیش کرنے کے لئے لکھا اور اس نے اپنے دلچسپ اور نادر تجربہ کو ''Essay'' کا نام دیا جو تحریر کا ایسا نمونہ تھا جس کی مثال پہلے کہیں موجود نہیں تھی۔ لفظ Essay فرانسیسی لفظ Essai کی انگریزی شکل ہے۔ Essai عربی لفظ ''اسعی'' کی فرانسیسی شکل معلوم ہوتی ہے۔ دونوں الفاظ کے معنی کوشش کے ہیں۔ اور فرانس ہی سب سے پہلا ملک ہے جہاں مضمون نگاری کی داغ بیل پڑی۔ لیکن مونٹین کو انشائیہ کا موجد تسلیم کرنے سے پہلے جب ہم قدیم ترین عالمی ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں انشائیہ کا خام مواد چین، عرب، ایران اور ہندوستان وغیرہ ممالک کی مختلف تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ اس کے علاوہ فرانسس بیکن انگلستان میں اٹھارہویں صدی کا ادیب تھا جس نے انگریزی انشائیہ پر کام کیا ہے۔

آگے بڑھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ انیسویں صدی دراصل ناول نگاری کی ترقی کا عہد مانا جاتا ہے، اور انگریزی انشائیہ نگاری کی کساد بازاری کا زمانہ۔ جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ناول نے انشائیہ کے طنز و ظرافت، تخیل پردازی اور شگفتہ بیانی جیسے عناصر کو اپنے اندر جذب کرلیا تھا۔ پھر بھی اس عہد میں چارلس لیمب اور ایونسن جیسے ممتاز انشائیہ نگار بھی موجود تھے۔

اردو ادب میں انشائیہ کا آغاز اس وقت ہوا جس وقت مغرب میں مونٹین اور بیکن اپنے انشائیے لکھ رہے تھے۔ اور عین اسی وقت ہندوستان میں ملا اسد اللہ وجہی نے ''سب رس'' جیسا بہترین باعث فخر انشائیہ پیش کیا جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ جس دور میں ملا اسد اللہ وجہی اپنا یہ انمول کارنامہ پیش کر رہے تھے وہ عصر صوفیانہ تحریریں، داستانوں اور مثنویوں کا عصر تھا۔ چونکہ اس وقت تحریر کی اس مجموعہ کا کوئی نام نہیں تھا اور باضابطہ اس وقت تک انشائیہ کو ''انشائیہ'' کا نام نہیں دیا گیا تھا لیکن پھر بھی اس میں انشائیہ کی خصوصیات پائے جانے کی وجہ سے انشائیہ کے طور پر قبول کیا جاسکتا ہے جب کہ اس کی بنیاد سولہوی صدی میں رکھ دی گئی تھی۔

سترہوی، اٹھارہوی صدی میں مغل حکمراں نے اپنی تمام توجہ بغاوتوں اور لڑائیوں کا سامنا کرنے میں صرف کردی جس کی وجہ سے اردو ادب کے نظم ونثر کی خوبصورتی کا خون خرابہ ہوا۔ باوجود اس کے ملا وجہی کے بعد انشائیہ کی خصوصیات عطا حسین خاں تحسین کی کتاب ''نوطرز مرصع'' میں ملتی ہے۔ سید انشاء کی کتاب جس میں انہوں نے رانی کیتکی کا قصہ نکھری ہندی میں لکھا ہے اور ''طلسم ہوشربا'' وغیرہ یہ چند ایسی کتابیں ہیں، جن میں انشائیہ کے آدھے ادھورے خام مواد ملتے ہیں جو انشائیہ کی ارتقائی تاریخ کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ سرسید کے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں انشائیہ کے کچھ نمونے ملتے ہیں۔ مولانا آزاد کو بھی انشائیہ نگاروں کے زمرہ میں کسی حد تک شامل کیا جاسکتا ہے۔ ان کی مشہور تصنف ''نیرنگ خیال'' میں انشائیہ کا انداز تھوڑا بہت ملتا ہے۔

انیسویں صدی کے ابتداء میں مضمون یا انشائیوں میں طنز وظرافت کی جھلک نظر آنے لگی۔ اور اسی دور میں انشائیہ عصر حاضر سے ہم آہنگ ہوتا نظر آنے لگا انیسویں صدی کی جو تحریریں تھیں وہ انشائیہ سے قریب ضرور تھیں لیکن پوری طرح انشائیہ نہیں کہلائی جاسکتی تھیں۔

بیسویں صدی میں اردو ادب کی دنیا میں انشائیہ ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا۔ انگریزی کے راست اثرات اردو ادب پر پڑنے لگے اور ناول، افسانہ، ڈرامہ اور انشائیہ ارتقاء کی منزل طے کرتے چلے گئے۔ اس طرح انشائیہ کی ہیئت صاف اور واضح ہونے لگی، یہی انشائیہ کا جنم تھا۔ کئی سالوں کا عرصہ بیت جانے کے باوجود بھی انشائیہ کی شبیہ مکمل طور پر سامنے نہیں آئی تھی۔ آزادی کے بعد وزیر آغا نے اُسے واضح کیا۔ اس کو نام اردو تعارف کے ساتھ اس کی خصوصیت کو پیش کیا۔ وزیر آغا سے پہلے اس صنف کا باقاعدہ نام نہیں تھا۔ وزیر آغا اس صنف کے نام کے ساتھ اسی کے فنی خصوصیات یا تکنیک بھی پیش کیں۔ وزیر آغا نے جب یہ پیش کیا تو سید حسنین کی جانب سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اگر ہم ماضی کے اوراق الٹیں تو آزاد کے ''نیرنگ خیال'' کئی جگہ لفظ ''انشاء پردازی'' نظر آتا ہے۔ تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انشاء پردازی کا مخفف ''انشائیہ'' کرنے کا کام وزیر آغا نے کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس صنف کی خصوصیات اور اصول وضوابط انہوں نے ہی پیش کئے اور اسی کے فروغ کے اہتمام کا سہرا ان ہی کے سر جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وزیر آغا انشائیہ کے موجد نہ ہوتے ہوئے اس کے بنیادگزار ہیں۔

اس صنف ادب میں زبان سازی کے اعتبار سے بھی اور خیال آفرینی کے نقطہ نظر سے بھی بیشتر نثر نگاروں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی، جس طرح اردو کے تقریباً سبھی شعرا نے غزل کی آبیاری کی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ کچھ کامیاب رہے اور کچھ ناکام۔ اسی طرح انشائیہ میں بھی کچھ کامیاب رہے اور کچھ بزرگوں نے انشائیہ نما کی سی تحریریں فرمائی۔

انشائیہ نگار کی زبان اور ذہن مفکر یا سائنس داں کی نہیں ہوتی لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ انشائیہ میں ادب سنجیدہ کی لہریں نہیں بہتیں یا فلسفہ وحکمت، علوم اور سائنس جیسے ادب سنجیدہ کے شعبے انشائیہ نگار کے لیے آوٹ آف باونڈ ہوتے ہیں۔ نہیں قطعاً ایسا نہیں۔ انشائیہ نگار ادب کے ہر شعبے اور زندگی کے ہر گوشے میں قدم رکھ سکتا ہے۔ اسے کہیں اور کوئی روک ٹوک نہیں سکتا، وہ آزاد اور مختار ہے۔ انشائیہ ایک طرح سے ادب لطیف کا پروردہ ہوتا ہے وہ زندگی اور اس کے مسائل کو اپنے مخصوص نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ حیات کے اور کائنات کے الگ الگ رنگوں کا تماشائی ہوتا ہے۔

اردو انشائیہ بیسویں صدی کی شروع کی دہائیوں میں اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ اس دور میں شعوری اور غیر شعوری طور پر

ان گنت انشائیے لکھے گئے جو کبھی مضمون، پرسنل ایسے، یا لائٹ ایسے کی حیثیت سے تحریر ہوئے تو کبھی انشائیے لطیف کے اہم ادبی شہ پاروں کے طور پر بھی انھیں پہچانا گیا۔ انشائیہ نگاروں نے قاری کے ذہن میں اتر کر اسے مختلف پہلوؤں پر منفرد زاویہ نظر سے دیکھنے پر مجبور کیا اور ان کی تحریریں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج بھی زندگی میں ہزاروں رہ گزر ایسی ہیں جن تک ہم پہنچ نہیں پاتے۔ انشائیہ نگار یہاں قاری کا بہترین رہنما ثابت ہوتا ہے اور یہی مرکزیت تمام اصناف ادب میں وہ بلند مقام حاصل کرتی ہے جو دوسرے نثر نگاروں کو نصیب نہیں ہوتی۔

انشائیہ اردو ادب میں ایسی صنف کہلانے کی حقدار ہے جس نے ادب کے مختلف گوشوں یعنی تاریخی، سیاسی، سماجی، جغرافیائی، سائنسی اور اخلاقی وغیرہ کا احاطہ کیا ہے۔ اور مختلف گوشوں میں سینکڑوں انشائیہ نگاروں نے اپنے انشائیہ تحریر کئے ہیں۔ جن میں ملا وجہی، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، مولانا الطاف حسین حالی، سرسید احمد خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، ماسٹر رام چندر، عبدالماجد دریابادی، میر ناصر علی، عبدالحلیم شرر، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری، مہدی افادی، خواجہ حسین نظامی، وزیر آغا، مشتاق احمد یوسفی، داؤد رہبر، جاوید صدیقی، رشید احمد صدیقی، احمد جمال پاشا، ظفر صدیقی، مشکور حسین یاد، محمود اختر، اقبال انجم، جمیل آزار، انور سدید، آدم شیخ، فرحت اللہ بیگ، اشرف صوجی، یوسف بخاری، خواجہ محمد شفیع، آصف علی مرزا محمد بیگ، مہیشور دیال، جاوید دشمشٹ، ضمیر حسن دہلوی، سجاد انصاری، پطرس بخاری، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، معین اعجاز، وحیدالدین، سلیم محمد، محمد اسماعیل، سجاد حسین، عبدالقادر سلطان، حیدر جوش، خلیقی دہلوی۔ وغیرہ وغیرہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انشائیہ کا گلشن مہکدار ہے۔

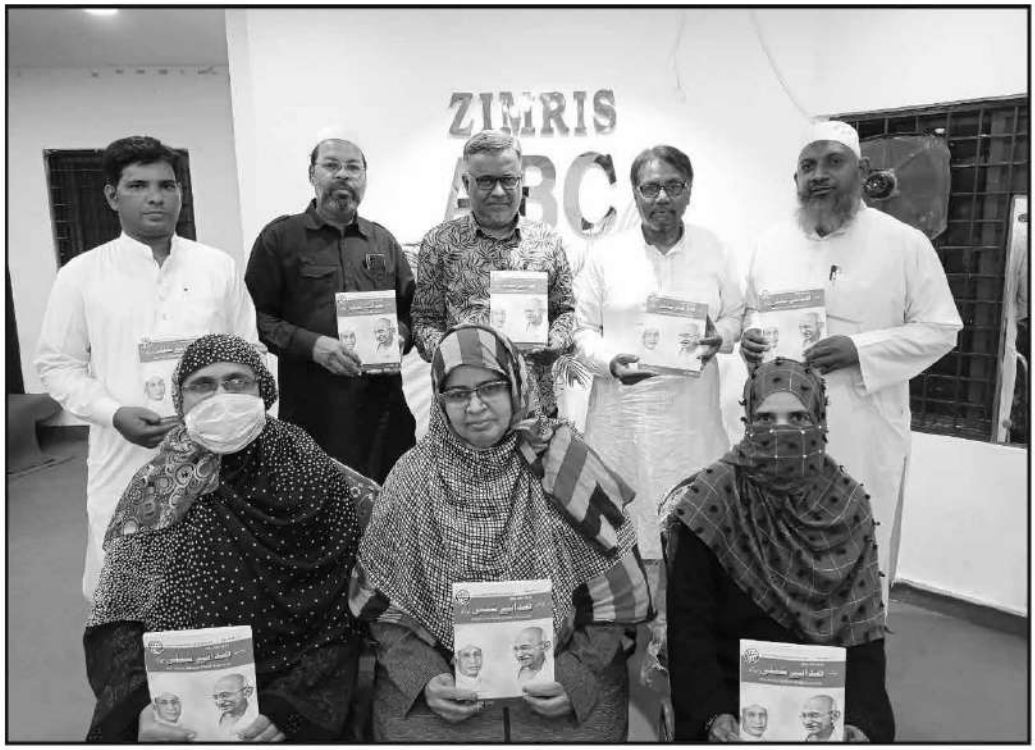

ماہ اکتوبر کا شمارہ ایڈیٹر ماہنامہ "صدائے شبلی"، ڈاکٹر مختار احمد فردین، پروفیسر مصطفیٰ علی سروری، ڈاکٹر مظفر علی ساجد، محسن خان، محترمہ رفیعہ نوشین، اور دیگر کے ہاتھوں میں

محمد خواجہ محی الدین۔ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

رباعی فن اور تکنیک

تمام تعریف خالق حقیقی کے لئے ہے جس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے سر پر اشرف المخلوقات کا تاج رکھا نطق کی قوت دیا اور قلم سے لکھنا سکھایا اور درود وسلام ہو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر جنہوں نے ہدایت کا نور لایا اور علم وادب کے زیور سے آراستہ کیا اور آپ کی آل اطہار اور اصحاب اخیار پر جنہوں نے علم وعمل کی قوت اور زبان وقلم کی طاقت سے ساری دنیا کو تہذیب وثقافت سے روشناس کیا۔

امابعد! ادب انقلابی طاقت وقوت ہے، وہ ذو معنیٰ لفظ ہے علم واخلاق کے لئے بھی بولا جاتا ہے، تو میرا یہ سخن بھی جس کے ذریعہ انسان اپنے مافی الضمیر کو دوسروں تک پہنچاتا ہے ادب معز بھی ہے اور نظم بھی ہے اور نظم کی تاثیر نثر سے بڑھ کر ہے، انسان فطرتاً نظم سے متاثر ہوتا ہے نثر کی طرح نظم کی بھی متعدد اصناف سخن ہیں اور اس کی تمام اصناف میں صنف رباعی کو اہمیت حاصل ہے، طویل البیان مضمون مکمل طور پر چار مصرعوں میں بیان کرنا یہ شاعر کا کمال سمجھا جاتا ہے۔

اردو ادب میں مختلف اصناف سخن (نثر ونظم) انسان کے جذبات واحساسات کا آلہ بنا رہے، اردو ادب میں صنف رباعی پر تحقیق ایک دشوار کن مسئلہ ہے، چونکہ دیگر اصناف سخن کی ہر دور میں آبیاری ہوتی رہی اور اِن اصناف میں طبع آزمائی کرنے والوں کی تعداد بھی کافی رہی، جس کی وجہ سے مواد کی بھی وسعت ہے، اس کے برخلاف رباعی کے بارے میں محققین اور ناقدین کے خیالات اور ان کے نظریات مشکل سے ملتے ہیں، اگر کہیں ہیں تو مختصر۔

اور ریاست حیدرآباد میں صنف رباعی اور رباعی گو شعراء پر بہت کم تحقیق ہوئی ہے، اس موضوع پر صرف دو محققین پروفیسر سیدہ جعفر (دکنی رباعیاں) اور سید مظفر خان، صاحب حیدرآبادی (جنوبی ہند میں رباعی گوئی، تذکرۃ الشعراء) نے صنف رباعی پر تحقیقی روشنی ڈالی ہے۔

رباعی فارسی کی ایجاد ہے، اس کی ابتداء کے بارے میں روایت ہے کہ ابوالحسن رودکی عید کے روز غزنہ کے کسی باغ میں بیٹھا موسم اور نظارے سے لطف لے رہا تھا، وہیں پر چند نوخیز لڑکے اخروٹوں سے کھیل رہے تھے، ان ہی میں کا ایک حسین لڑکا اونچی جگہ پر اخروٹ ڈالا، اخروٹ لڑھکتا ہوا جاتا اس کی دلکش آواز سن کر لڑکے کے منہ سے بے ساختہ ایک فقرہ نکلا:

''غلطاں غلطاں ہمی رود تا سر گو''

مذکورہ فقرہ چونکہ وزن میں تھا ابوالحسن رودکی کو پسند آیا، اس نے اس جملہ پر مزید اور تین مصرعے لگائے اس طرح رباعی وجود میں آئی۔

دوسری روایت کے مطابق مذکورہ جملہ ابوالحسن رودکی نے نہیں بلکہ یعقوب لیث صفاری نے اپنے بیٹے سے سنا جو کہ موزوں تھا اور اس پر مزید اصلاح کے لئے شعراء وادباء کے پاس حاضر ہوا، ابوالحسن رودکی نے اس جملہ پر مزید تین اور مصرعے لگائے اس طرح ''رباعی'' وجود میں آئی۔

رباعی کی ابتدا سے متعلق اگرچہ کہ مختلف روایتیں پائی جاتی ہیں لیکن اِس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ اس کا موجد ''ابوالحسن رودکی'' ہے۔

اردو میں رباعی کی روایت کے متعلق بھی مختلف اقوال ملتے ہیں، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ اور سلام سندیلوی صاحب کے مطابق محمد قلی قطب شاہ پہلے رباعی گو شاعر ہیں، جبکہ پروفیسر سیدہ جعفر اور دیگر محققین کے مطابق حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ پہلے رباعی گو شاعر ہیں۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر نے اپنے ادعا کے ثبوت میں اسٹیٹ لائبریری (مکتبہ آصفیہ) سے جو رباعی حاصل کی وہ درج ذیل ہے:

مشہود بہ حیرت ہو دگر ہیچ ہے واللہ
مرنے کے انگے مر کے ہو فانی فی اللہ
خناس کے وسواس سوں توں ہو پامال
لاحول ولا قوۃ الا باللہ

رباعی اس مختصر نظم کو کہتے ہیں جو صرف چار مصرعوں پر مشتمل ہو، جس کا پہلا دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے، جو مخصوص اوزان (بحر ہزج) میں نظم کی جاتی ہے، رباعی میں کسی مضمون کو مصرعہ بہ مصرعہ ایسا پیش کیا جاتا ہے کہ خیال کے تسلسل کے ساتھ ساتھ ارتقاء پایا جاتا ہے اور چوتھے مصرعہ میں خیال اپنی تکمیل کو پہونچتا ہے، آخری مصرعہ معنوی اعتبار سے سب سے اچھا' برجستہ' زوردار اور پر لطف ہونا چاہئے جیسے:

لے لے کے خدا کا نام چلاتے ہیں
پھر بھی اثرِ دعا نہیں پاتے ہیں
کھاتے ہیں حرام لقمہ پڑھتے ہیں نماز
کرتے نہیں پرہیز دوا کھاتے ہیں

رباعی عربی لفظ ہے جو رباع سے مشتق ہے، رباع کے معنی ہیں ''چار چار'' اس صنف کو رباعی اس بناء پر کہا جاتا ہے کہ اس میں چار مصرعے ہوتے ہیں، زمانہ قدیم میں اس کو ''دوبیتی'' اور ترانہ بھی کہا جاتا تھا۔

رباعی اس مختصر نظم کو کہتے ہیں جو صرف چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے، جس کا پہلا دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے، جو مخصوص اوزان میں لکھی جاتی ہے ذیل کی رباعی ملاحظہ ہو[2]

بیکس ہوں نہ مال ہے نہ سرمایا ہے
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لایا ہے
یا رب تری رحمت کے بھروسے امجدؔ
بند آنکھ کئے یوں ہی چلا آیا ہے[3]

اس رباعی کے پہلے' دوسرے اور چوتھے مصرعہ میں 'سرمایا' 'لایا' 'آیا' قافیے ہیں، ان مصرعوں کو ''مقفی مصرع'' کہتے ہیں، اور تیسرے مصرعہ کو جس میں عام طور پر قافیہ نہیں ہوتا ''خصّی'' کہتے ہیں۔

جنت کا سماں دکھادیا ہے مجھ کو
کونین کا غم بھلادیا ہے مجھ کو
کچھ ہوش نہیں کہ میں ہوں کس عالم میں
ساقی نے یہ کیا پلادیا ہے مجھ کو[4]

مذکورہ رباعی میں 'دکھا' 'بھلا' اور 'پلا' قافیوں کے ساتھ ساتھ ردیف 'دیا ہے مجھ کو' بھی ہے، اور جس رباعی میں ردیف نہیں ہوتی اس کو ''غیر مردّف'' کہتے ہیں۔

نوٹ: کبھی کبھی رباعی کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں، ایسی رباعی کو مربع کہتے ہیں۔

رباعی میں کسی مضمون کو مصرعہ بہ مصرعہ ایسا پیش کیا جاتا ہے کہ خیال کے تسلسل کے ساتھ ساتھ ارتقاء پایا جاتا ہے اور چوتھے مصرعہ میں خیال اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے، معنوی اعتبار سے رباعی کا چوتھا مصرعہ خاص سب سے اچھا' برجستہ' زوردار اور پرلطف ہونا چاہئے، کیونکہ چوتھا اور آخری مصرعہ رباعی کا خلاصہ ہوتا ہے، مثلاً

جو روضۂ شاہِ کربلا تک پہنچے
بے شبہہ وشک وہ مصطفیٰ تک پہنچے
اللہ رے عز وشانِ زوّارِ حسینؑ
پہنچے جو حسین تک وہ خدا تک پہنچے[5]

رباعی کے موضوعات:

دیگر اصنافِ سخن کی طرح اس کا میدان وسیع ہے، رباعی کے لئے کسی خاص مضمون کا ہونا ضروری نہیں، بلکہ اس میں فلسفیانہ' حکیمانہ' صوفیانہ' اخلاقی اور عشقیہ جیسے مضامین ہوتے ہیں، رباعی میں سماجی مسائل جیسے مضامین بھی ہوتے ہیں، چند مختلف رباعیات درج ذیل ہیں:

سامانِ خورد وخواب کہاں سے لاؤں
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالبؔ لیکن
خس خانہ وبرفاب کہاں سے لاؤں[6]

اس رباعی میں مرزا غالبؔ نے غایت درجہ کی شوخی کی ہے۔

ہر چیز مسبب سبب سے مانگو
منّت سے خوشامد سے، ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو
بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو[6]

مذکورہ رباعی میں امجدؔ حیدرآبادی نے اخلاق کے ذریعہ کردارسازی کی کوشش کی ہے۔

تیرا شرف ادراک میں تیں ٹاک آیا
جم تیرا سبق نعبد لیاک آیا
تیرا سو نشاں مصحفِ پاک آیا
لولاک لما خلقت الافلاک آیا[7]

قلی قطب شاہ کی یہ رباعی، نعتیہ ہے۔

اوزانِ رباعی:

رباعی کے اوزان مخصوص ہوتے ہیں، ان کے علاوہ دیگر اوزان میں لکھے ہوئے چار مربوط مصرعے خواہ قافیہ کی شرط پوری کرتے ہوں رباعی نہیں ہوتے، رباعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ رباعی ہی کے مخصوص وزن میں موزوں کی گئی ہو۔

رباعی کے لئے چوبیس (۲۴) اوزان مقرر ہیں، جن کا تعلق 'بحرِ ہزج' سے ہے، اِن چوبیس (۲۴) اوزان کا ماخذ یہ دو اوزان ہیں:

(۱) مفعول مفاعیل مفاعیل فعل (۲) مفعول مفاعلن مفاعیل فعل

بعض ماہرین عروض نے ان اوزان کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، جنہیں ''شجرہ'' کہا جاتا ہے، مفعول سے شروع ہونے والے اوزان کو ''شجرۂ اخرب'' میں شمار کیا جاتا ہے، اور مفعولن سے شروع ہونے والے اوزان کو ''شجرۂ اخرم'' میں شمار کیا جاتا ہے۔

ان چوبیس (24) اوزان میں کسی بھی وزن میں رباعی کہی جاسکتی ہے، یہاں تک کہ رباعی کے چاروں مصرعے چار مختلف اوزان میں لکھے جاسکتے ہیں۔

صنف رباعی اور مشاہیر کے اقوال:

(۱) مولوی نجم الغنی رامپوری بحرالفصاحت میں لکھتے ہیں:

''مولانا کاشف واعظ نے لکھا ہے کہ اس کو رباعی اس لئے کہتے ہیں کہ یہ بحر ہزج سے مخصوص ہے اور پھر ہزج عرب کے شعروں میں چار اجزاء پر ختم ہوتی ہے، پس رباعی کی ہر ایک بیت دو بیت مربع کی طرح ہوگی اور مجموعہ چار بیتیں ہوگا۔ ہزج مربع الاجزا ہے اس کو اہل فارس دوبیتی کہتے ہیں اور بعض ترانہ بھی، رباعی چار مصرعوں پر تمام ہوتی ہے اس لئے شاعر کو چاہئے کہ اس کے الفاظ میں نہایت کوشش کرے، اگر تیسرا مصرعہ بھی قافیہ رکھتا ہوگا تو اس کو مربع کہیں گے ورنہ خصی بولیں گے''۔[9]

(۲) رباعی ابن قیس کی نظر میں:

''ارباب موسیقی نے اس وزن میں اچھے اچھے راگ اختراع کئے ہیں اس لئے اس کو فارسی میں ترانہ بھی کہتے ہیں، رباعی کے مخصوص اوزان ہیں ان سے ہٹ کر رباعی نہیں کہی جاسکتی رباعی میں چار مصرعے ہوتے ہیں جن میں چوتھا مصرعہ پہلے اور دوسرے مصرعہ کے ساتھ قافیہ میں متفق ہوتا ہے، تیسرا مصرعہ لازم نہیں کہ قافیہ میں ہو، البتہ چوتھا مصرعہ نہایت خوبی کے ساتھ ادا ہونا چاہئے جس سے تینوں مصرعوں میں جان پڑ جائے''۔[10]

(۳) فرمان فتح پوری:

''تاریخ شاہد ہے کہ رباعی نے رکاکت، ابتذال، فحاشی، بیہودہ گوئی اور ہجو سے اپنا دامن کبھی آلودہ نہیں کیا۔ رباعی کی یہی ایک معنوی خصوصیت ہے جو اسے دیگر اصناف سخن کے مقابلہ میں ممتاز و موقر بنانے کے لئے کافی ہے''۔[11]

(۴) رباعیات شاد عظیم آبادی میں حمید عظیم آبادی تحریر کرتے ہیں:

''اقسام نظم میں اوزان کے ساتھ انداز بیان خیالات کی ندرت، زور بیان، طرز ادا کی دلکشی، مضمون کی دل آویزی یہ ساری خصوصیات بھی رباعی گوئی کا جز ہیں۔ جہاں خیالات ترفع اس کی جان ہے وہاں طرز ادا کی سلاست بھی اس کی روح رواں ہے۔ حکمت، اخلاق، فلسفہ اور تصوف کے مسائل دلکش انداز میں بیان کرنا

اس کے لوازم میں شامل ہے، عشقیہ مضامین بھی اس انداز میں ہوں جس طرح رباعیات سرمد میں پائے جاتے ہیں"۔

(۵) پروفیسر مغنی تبسم:

"رباعی کہنا گویا عطر کشید کرنا ہے، رباعی گو شاعر اپنے مشاہدات اور تجربات کو جذبے سے ہم آہنگ کر کے فکر کی بھٹی میں تپاتا ہے تب کہیں ایک اچھوتا خیال دل کی آواز بن کر ابھرتا اور دل میں پیوست ہو جاتا ہے"۔[۱۲]

(۶) علامہ اقبال رباعیات محروم کے دیباچہ اول میں لکھتے ہیں:

"رباعی کو ترانہ کہتے تھے اور اس کو بالعموم گانے کے لئے تصنیف کیا جاتا تھا۔ فارسی شاعری میں رفتہ رفتہ اس میں ایسی وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہوئی کہ قصیدہ اور مثنوی تو درکنار غزل بھی اس کے سامنے ناچیز ہو کر رہ گئی۔ مضامین جس خوش اسلوبی دلفریبی اور اختصار کے ساتھ فارسی رباعی میں ادا ہوئے وہ دوسری شکل میں ادا نہ ہو سکے"۔

رباعی اور قطعہ میں امتیاز:

اہل عروض نے رباعی اور قطعہ میں امتیاز کیا ہے اور دونوں کے وجود کو الگ الگ تسلیم کیا ہے، رباعی و قطعہ کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) رباعی کا اخرب واخرم کے چوبیس اوزان میں سے کسی ایک وزن میں ہونا لازمی ہے۔

(۱) قطعہ کے لئے کوئی مخصوص بحر نہیں

(۲) رباعی میں مطلع ضرور ہونا چاہئے

(۲) قطعہ میں مطلع ہو یا نہ ہو

(۳) رباعی صرف چار مصرعوں کی ہوتی ہے

(۳) قطعہ میں اشعار کی تعداد متعین نہیں ہے۔[۱۳]

پروفیسر محمود شیرانی بھی اسی کے قائل ہیں چنانچہ لکھتے ہیں:

"لیکن ادبی و عروضی نقطۂ نظر سے بلکہ رواجاً بھی رباعی وہی ہے جو بحر ہزج کے اخرب واخرم کے چوبیس اوزان مقررہ میں سے ہو"۔

رباعی کی فنی مشکلات:

مانا گیا ہے کہ رباعی ایک مشکل صنف سخن ہے اس پر قابو پانا آسان نہیں ہے، دراصل اس کے لئے نظر کی وسعت اور شعور کی پختگی کی ضرورت ہے اسی لئے رباعی میں کامیابی اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب شاعر کہنہ مشق ہو جاتا ہے۔

تلوک چند محروم نے رباعی میں پائی جانے والی دشواری کو اس طرح بیان کیا:

"مسلم ہے کہ رباعی لکھنے کے لئے کافی مشق سخن اور پختگی عمر کی ضرورت ہے اور یہی وجہ ہے کہ عام طور پر شاعر کی زندگی میں رباعی نویسی کا دور آخر میں آتا ہے"۔[۱۴]

پروفیسر ضیا احمد صاحب لکھتے ہیں:

"رباعیاں لکھنا بظاہر بہت آسان ہے مگر درحقیقت بہت دشوار"۔[۱۵]

رباعی کے مصرعے:

رباعی چونکہ مختصر صنف سخن ہے اس لئے شاعر کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ چاروں مصرعوں کو بہت سلیقہ کے ساتھ نظم کرے تاکہ خاطر خواہ اثر حاصل ہو سکے۔ اسی لئے ملا حسین واعظ کاشفی کا خیال ہے کہ "چونکہ رباعی کے صرف دو بیت ہوتے ہیں لہٰذا شاعر کو اس کے اجزا کے ترکیب و ترتیب میں سعی بلیغ لازم ہے تاکہ محاسن وصنائع شعری میں سے کوئی شئے اس میں پیدا ہو جائے"۔[۱۶]

رباعی کا چوتھا مصرعہ:

رباعی میں خاص بات یہ ہوتی ہے کہ اس کے تین مصرعوں میں تین باتیں کہی جاتی ہیں اور چوتھے مصرعہ میں تینوں مصرعوں کا نچوڑ رکھ دیا جاتا ہے یہی مصرع سارے مضمون کا ماحصل ہوتا ہے، اسی لئے چوتھا مصرعہ ہمیشہ تینوں مصرعوں کی بہ نسبت زوردار اور پر اثر ہوتا ہے۔ نواب سید امداد امام اثر نے "کاشف الحقائق" میں چوتھے مصرعہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے:

"چونکہ یہ صنف شاعری عروض ترکیب کی رو سے بہت محدود ہے، شاعر کو لازم

ہے کہ منتخب مسائل کو اس طرح موزوں کرے کہ
تھوڑے لفظوں میں بہت معنی پیدا ہوں اور چوتھا
مصرعہ بہت پر مضمون اور پرزور ہو۔ ایسا گویا کہ
ہر سہ مصراعہائے کا خلاصہ یا نتیجہ ہو"۔ ۱۷

مولانا احسن مارہروی نے "کلیات ولیؔ" کے دیباچہ میں رباعی کے چوتھے مصرعہ کی اہمیت کو واضح کیا ہے:

"چار مصرعوں میں آخری مصرعہ رباعی کی جان ہوتا ہے، اور اس کو زوردار بنانے کے لئے تین مصرعے بہم پہنچائے جاتے ہیں"۔ ۱۸

بہر حال چوتھا مصرعہ حاصل رباعی بھی ہو اور زبان کے اعتبار سے چست بھی۔

رباعی کی زبان:

مختلف اصناف سخن کے الفاظ مختلف ہوتے ہیں، قصیدہ کے لئے پرشکوہ اور شاندار الفاظ۔ غزل کے لئے نرم، نازک، شیریں، دلکش اور حسین الفاظ۔ اس کے برخلاف رباعی کے لئے فکر یہ ہے جو چند خاص مضامین کے لئے مخصوص ہوگئی ہے۔ اس میں فکری عناصر میں یا نشاطیہ وطربیہ دونوں میں زبان کی ملائمت اور سادگی میں پرکاری درکار ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی زبان نہایت سلجھی ہوئی اور صاف وشستہ ہوتا کہ قارئین کے دل ودماغ اس کے اثرات کو فوراً قبول کرلیں۔

حمید عظیم آبادی نے رباعی کی زبان پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"جہاں خیالات کا ترفع اس کی جان ہے، وہاں طرز ادا اور زبان کی سلاست بھی اس کی روح رواں، فلسفہ وتصوف، حکمت واخلاق کے مسائل دلکش ودلآویز پیرائے میں بیان کرنا اس کے لوازم میں شامل ہے۔ عشقیہ مضامین بھی اگر ہوں تو خاص انداز میں بیان کیے جائیں جس کی زندہ مثال سرمدؔ کی رباعیاں ہیں"۔ ۱۹

حوالہ جات

۱ مصباح اللغات، ص:۲۷۵، ۲۷۶۔
۲ مضمون ڈاکٹر خالد سعید، مطبوعہ نصاب فاصلاتی تعلیم MANUU ص:۲۵۴۔
۳ رباعیات امجد مکمل، حصہ اول، ص:۳۶۔
۴ مطبوعہ نصاب ایم، اے فاصلاتی تعلیم MANUU ص:۲۵۶۔
۵ مطبوعہ نصاب ایم، اے فاصلاتی تعلیم MANUU ص:۳۰۱۔
۶ ترجمان غالب، سید شہاب الدین مصطفیٰ، سن اشاعت ۱۹۵۶ء، ص:۴۶۴
۷ رباعیات امجد مکمل۔
۸ مطبوعہ نصاب ایم، اے فاصلاتی تعلیم MANUU ص:۲۸۷۔
۹ جنوبی ہند میں رباعی گوئی، "تذکرۃ الشعراء"، مصنف صاحب حیدرآبادی، ص:۲۰۔
۱۰ جنوبی ہند میں رباعی گوئی، "تذکرۃ الشعراء"، مصنف صاحب حیدرآبادی، ص:۲۰۔۲۱۔
۱۱ جنوبی ہند میں رباعی گوئی، "تذکرۃ الشعراء"، مصنف صاحب حیدرآبادی، ص:۲۱۔
۱۲ بحوالہ "رباعیات مظہر" مصنف محمد مظہر محی الدین، ص:۷۔
۱۳ تنقید شعر العجم، ضمیمہ مصنفہ پروفیسر محمود شیرانی صفحہ ۵۶۲۔
بحوالہ اردو رباعیات، ڈاکٹر سلام سندیلوی، شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی۔
۱۴ "رعنائیاں" مصنفہ برج لال رعنا۔ دیباچہ منشی تلوک چند محروم، صفحہ:۵۔
۱۵ "دیوان مومن" مرتبہ پروفیسر احمد بدایونی، دیباچہ ص:۲۰۔
۱۶ رباعیات باباطاہر، مولفہ ڈاکٹر عندلیب شادانی، ص:۸۔
۱۷ کاشف الحقائق، حصہ دوم، مؤلفہ نواب سید امداد امام اثر، ص:۳۷۴۔
۱۸ کلیات ولی، مؤلفہ مولانا احسن مارہروی، ص:۷۶۔
۱۹ رباعیات شاد عظیم آبادی، مولفہ حمید عظیم آبادی، ص:۲۵۔

محمد شوکت فہیم احمد (ریسرچ اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد)

غالب شناسی کی تحقیقی اور تنقیدی اہمیت

علوم وفنون کی بڑھتی ہوئی ترقی اور دن بہ دن معلومات میں اضافے کا نتیجہ یہ ہے کہ علمی طور پر نئے امکانات کی تلاش اور اس کے توسط سے جدید رجحانات اور عمل کرنے کی کوشش کا سلسلہ تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتا جارہا ہے۔ اس بارے میں بہر حال غور کیا جاسکتا ہے کہ کوئی بھی علم اور فن ہی نہیں، بلکہ شخصیت کے کارناموں کی وسعت اور اس کی جامعیت کے بارے میں بہر حال غور کیا جانا چاہئے۔ غالب شناسی یا غالبیات کے علاوہ غالب فہمی کے بارے میں یہی نکتہ اہمیت کا حامل ہے کہ اردو کے اس شاعر کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس شاعر نے ناگفتہ بہ حالات اور سیاسی اور معاشی سطح پر پیدا ہونے والی بے اعتدالیوں اور ملک کے حالات کی خرابی کے باوجود بھی اپنی فکر اور سوچ کے دھارے کو پراگندہ ہونے نہیں دیا۔ اور ساری زندگی شعر گوئی کے ذریعہ باضابطہ فکر وفہم اور ادراک کے مختلف گوشوں کو نمایاں کرنے میں گزار دی۔ غالب نہ صرف جدت پسند شاعر تھے بلکہ اپنے زمانہ کے حالات سے مقابلہ کرنا اور فکری وفطری سطح پر اس دور کے تقاضوں کے بارے میں غور کرنے کے علاوہ باضابطہ انسانی زندگی اور اس کے مراحل کو بھی زیر نظر رکھنا مرزا غالب کی مزاج کی خصوصیت تھی۔ اسی لئے انہی اپنے دور کے مایہ ناز شاعر اور فکر وفلسفہ کے علاوہ اسلامی افکار اور تصوف کے معرکوں کو بیان کرنے کا سلیقہ حاصل رہا ہے۔ یہ بات عیاں ہے کہ مرزا غالب نے شعر گوئی کے لئے اپنے دور کے فارسی شاعر قتیل کی تقلید کا رویہ اختیار کیا۔ جس قلم کار یا شاعر کو خدا کی جانب سے بے شمار دولتیں عطا ہوتی ہیں وہ کسی صورت بھی خوشہ چینی کے ذریعہ زندگی گزار نہیں سکتا بلکہ اس کی نباض طبیعت ہمیشہ کچھ نہ کچھ جدید اور فکر کی گہرائیوں کو ٹٹولنے پر مجبور کرتی رہتی ہے۔ غالب اپنے دور کے ایک ایسے شاعر گزرے ہیں کہ جن کے دور میں سیاسی حالات کی خرابی اور انگریزی دور اقتدار میں اپنی مذہبی مجبوری کے علاوہ بھائی کی رحلت پر تدفین کی دشواری جیسے مرحلوں سے گزرنے کے باوجود بھی ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے کبھی ہمت کو شکستہ ہونے نہیں دیا۔ غالب کی تمام تر شاعری کا یہی کمال ہے کہ انہوں نے وقت حالات اور افکار کی دوڑ میں پست ہمتی کو آگے بڑھنے نہیں دیا۔ بلکہ پورے سلیقے اور اختیار کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے مسائل کو نبرد آزما ہونے کا طریقہ اختیار کیا۔ غالب کی شاعری میں موجود امتیازات اور ان کی نثر میں شامل نادر خصوصیات کو ہی غالب شناسی کی اہمیت کا درجہ دیا جائے گا۔ لازمی ہے کہ غالب کا کلام اور ان کی شاعری میں جس قدر درد وکسک اور اظہار کی ہمہ گیری شامل ہے ویسا ہی نمایاں انداز ان کے نثری حصے میں بھی نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ سب سے پہلے غالب جیسے شاعر کو غالبیات کا نمائندہ بنانے والا رویہ اور شاعری کے ذریعہ غالب شناسی کی فکر سے آراستہ کرنے والی سوچ کو نمائندگی دی جائے گی۔ کیوں کہ غالب نے اپنی شاعری کے ذریعہ باضابطہ اس دور کے سماجی، سیاسی اور معاشرتی تصورات سے ہٹ کر اپنے خیالات پیش کئے تھے اور اس قدر جامع اور مربوط طریقے سے خیالات کی عکاسی کی کہ جس کی وجہ سے کسی اور شاعر کو وہ امتیاز حاصل نہ ہوسکا۔ اسی امتیازی خصوصیت کی وجہ سے غالبیات اور غالب شناسی کے علم کی شروعات ہوتی ہے۔ غالب اور ان کی شاعری ہی نہیں بلکہ نثر نگاری کے امکانات کو تلاش کرنے کی کوشش کرنے والے پہلے ادیب کی حیثیت سے خود ان کے شاگرد رشید خواجہ الطاف حسین حالی اور ان کی لکھی ہوئی کتاب "یادگار غالب" وہ پہلا نمونہ ہے جس کے ذریعہ غالبیات کی ابتداء اور غالب شناسی کی منزل میں داخل ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ نہ صرف غالب کی رحلت کے 100 سال کے اندر انہیں عالم گیر شہرت کا درجہ حاصل ہوا بلکہ خود ہندوستانی حکومت نے ہندوستانی زبانوں کے کسی شاعر یا ادیب کے کارناموں کو منظر عام پر لانے کے لئے ویسی جستجو نہیں کی جیسی کہ مرزا غالب کی صد سالہ تقاریب کے موقع پر انجام دی۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ فارسی زبان اور ادب کی تاریخ میں جس طرح تین بڑے شعراء کو یہ اعزاز حاصل ہے جیسے مولانا روم، عمر خیام اور حضرت سعدی علیہ الرحمہ کا کلام فارسی ادب کا اہم ذخیرہ ہے تو اسی طرح اردو زبان وادب کی تاریخ میں

مرزا غالب ایک ایسے شاعر ہیں جن کے کلام کو عالمی اعتبار سے اہمیت حاصل ہوئی اور دنیا کی بیشتر زبانوں میں ان کے کلام کے ترجمے اور وضاحتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے غالب شناسی اور ان کی فکر کی گہرائی و گیرائی کو اہمیت دی جاتی ہے۔

(الف) غالب شناسی نئے تقاضوں کی آماجگاہ:

غالبیات یا غالب شناسی کہ بے شمار پہلو منظر عام پر آچکے ہیں۔ غالب کے فن اور ان کی خصوصیات کی نشاندہی کرتے ہوئے اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ جس سے غالب کے وجدان اور ان کے فکری وقار کا پتہ چلتا ہے۔ اس خصوص میں ڈاکٹر اسد اریب لکھتے ہیں:

''شاعری کی بنیاد اگلے زمانے کے عالموں نے اس جذبے پر رکھی تھی جسے وجدان کہتے ہیں۔ مگر اعلیٰ درجہ کی شاعری کے لئے علم اور علم کے لئے تدبیر اظہار کی بھی ضرورت ہے۔ شاعری لڑکوں کا کھیل نہیں اور نہ ہی اس کم ظرف بڑھیا کا تن ہے جو کاتا اور لے دوڑی۔ یہ مراحل صرف وہی لوگ طئے کر سکتے ہیں جو موضوع شاعری کے بنیادی خیالات اور اس کے فکری پس منظر سے بخوبی آگاہ ہوں اور اس فلسفۂ علم کے کامل منتہی بھی ہوں''۔

ایک گزشتہ اور دوسری گزشتنی' ان دو صدیوں میں اردو کے تین بڑے شاعر غالبؔ، انیسؔ اور اقبالؔ گزرے ہیں۔ ان تینوں کی کہانی عظمت و انفرادیت کے اعتبار سے کم و بیش یکساں ہے۔ ان تینوں نے اپنے عہد کے پرانے سانچوں کو کاری ضربیں لگا کر اپنی جدت پسند طبیعت کے مطابق ڈھال لیا۔

غالبؔ کا ذہن بھی ان نئے تقاضوں کی آماجگاہ رہا۔ انہوں نے اپنی عقل' برتری اور اپنے حکیمانہ شعور کی بدولت اپنے عہد پر فتح حاصل کی۔ وہ غالبؔ رہے اور ان کا زمانہ مغلوب۔ انیسویں صدی سے لے کر آج تک جب بیسویں صدی نے شعری ارتقاء کے کئی مدارج طئے کر لئے ہیں' غالب کو بلا اختلاف اور بے شک و شبہ ایک بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے اور بڑائی میں اس کی فرزانگی کا بھی ہاتھ ہے اور اس کی تجدد پسند طبیعت کا بھی۔

یہ وہ باتیں ہے جن سے غالبؔ کے نئے ذہن کا پتہ چلتا ہے۔ یہ وہ نیا ذہن ہے جس نے اردو شاعری کو خیالات کے نئے آفاق سے آشنا کیا۔ مثنوی ہو' غزل ہو' قصیدہ یا قطعہ فرد ہو یا مسلسل خیالات والی نظمیں' غالبؔ کی انفرادیت کا رنگ ہر جگہ نمایاں ہے۔ انہوں نے ہمارے شاعری کے بعض مروج اور متواتر خیالات' اسالیب اور فکری رجحانات میں واضح تبدیلیاں کیں اور یہ تبدیلیاں ان اساسی تصورات میں بھی برپا کیں جن پر اب تک اردو شاعری کا مدار قائم تھا۔ مثال کے طور پر یہ کہ اردو شاعری کا ''معشوق'' عاشق پر ہمیشہ سے حاوی چلا آتا تھا۔ عاشق کے مقابلے میں ''محبوب'' کی برتری ایک مسلمے کی حیثیت رکھتی تھی۔ عاجزی' معذرت خواہی اور تحقیر عاشق کا مقدر تھی۔ غالبؔ نے اردو شاعری میں پہلی بار محبوب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا معذرت خواہی کی بجائے بازپرس اور افکساری کی بجائے تفاخر سے کام لیا۔

عجز و نیاز عشق سے آیا نہ راہ پر ☆ دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچئے

غالبؔ کہتے ہیں: میرا محبوب میری نیاز مندی اور عاجزی سے تو مجھ پر مہربان نہ ہوا اس کے تکبار کا اب علاج یہی ہے کہ اس سے مستفید ہونے کے لئے طاقت کا استعمال کیا جائے''۔

نازاں ہے اپنے حسن پر مغرور وہ اسد
دکھلا کے اس کو آئینہ توڑا کرے کوئی

ڈاکٹر اسد اریب نے غالب کی شاعری کی ان انفرادی خصوصیات سے آگاہی دی ہے جس کے وہ اردو شاعری کا آفاقی تصور قیاس کرتے ہیں۔ جس کے لئے مرزا غالب نے مثنوی' غزل' قصیدہ' قطعہ یا فرد ہی نہیں بلکہ تضمین کے دوران بھی اختیار کیا ہے۔ غالب شناسی کے دوران ان کے اساسی تصورات کو پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ تمام روایتیں جو اردو شاعری کے مدار کا درجہ رکھتی تھیں' مرزا غالب نے انہیں تبدیلیوں سے وابستہ کیا ہے۔ اسی لئے غالب شناسی میں ان کی انفرادیت مسلمہ ہے۔

غالب کہتے ہیں: میرا محبوب آئینے میں اپنے آپ کو جس قدر دیکھتا ہے اتنا ہی مغرور ہوتا جاتا ہے اب اس کے غرور کا علاج یہی کہ آئینہ کو (جو اس کے غرور کا اصل سبب ہے) توڑا جائے۔

بگڑتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو؟

غالبؔ کہتے ہیں تمہیں تو اپنے جیسا کوئی دوسرا گوارہ ہی نہیں'

خواہ آئینے میں تمہارا ہی عکس رخ سہی اگر کہیں خدانہ خواستہ اس بستی میں جہاں تم ہو کوئی ایک دو حسین اور نکل آئیں تو تمہارے غیظ و غضب کا کیا عالم ہوگا۔

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر

کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

غالب کہتے ہیں: تمہاری بداخلاقی صرف مجھی پر روا نہیں۔ ہر شخص ہی تمہاری ترش روی اور سخت کلامی کا شاکی ہے۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو؟

غالب کہتے ہیں: میرا محبوب اپنے تکبر کے سبب مجھ پر التفات نہیں کرتا اور چاہتا ہے کہ ملتفت نہ ہونے کا سبب اس سے پوچھوں۔ میری بلا سے التفات نہیں کرتا نہ کرے۔

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا

تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

فطرت انسانی کی رمز شناس خصوصیت کی نشاندہی کرتے ہوئے غالب نے فکر و فلسفہ سے استفادہ کے ساتھ ساتھ باضابطہ عملی زندگی کو بھی نمائندگی کا وسیلہ بنایا ہے۔ لازمی ہیکہ زندگی صرف فکر اور فلسفہ کا نام نہیں، بلکہ دنیا میں اوقات گزارنے کا ایک ایسا مرحلہ ہے، جس کے ذریعہ انسان کو ہر قسم کی کامیابی و ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لازمی ہے کہ زندگی کی اس حقیقت کو سمجھنے کا وصف مرزا غالب کی شاعری میں واضح ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے باضابطہ غالب شناسی کے ذریعہ زندگی کی حقیقتوں کو محسوس کرتے ہوئے زندگی کے نئے تقاضوں کو اشعار میں پیش کرنے کے سلیقے کو نمایاں کیا ہے۔

غالب کہتے ہیں: جب عشق ناکامی آرزو ہی کا نام ہے اور معشوق کے ستم سہنا ہی عاشق کا مقدر ہو تو پھر اے میرے محبوب یہ کیا ضروری ہے کہ تجھی سے عشق کریں؟

غالب کو اپنے معاصر فنکاروں سے جو عقلی برتری حاصل تھی اس کا منطقی لازمہ بھی یہی تھا کہ وہ حسرت تعمیر سے ہاتھ نہ کھینچیں۔ غالب سے پہلے اردو غزل نے کئی مرحلے طے کر لئے تھے۔ مسلسل سفر اور سفر یکساں کیفیتوں نے اس کے چہرے پر تھکن کے آثار پیدا کر دیئے تھے۔ جیسے کی درماندہ رہرو کے چہرے پر زندگی کی توانائی اور بھرپور رونق ہویدا نہیں ہوتی۔ اردو غزل کے چہرے پر بھی اضمحلال کے یہی آثار نمایاں تھے۔ غالب نے اپنی آسمانی فراست اور حکمت سے شاعری کے اس انفعال کو دور کیا اور اردو غزل میں انہوں نے جو تجربے کئے وہ تجربے ہی احساس کا حاصل ہیں۔ غزل تو پھر غزل ہے۔ اس عہد کے زمزمہ شعر کی سب سے زیادہ دل نشیں آواز اردو قصیدے کو بھی سنبھالا دیا۔ سودا اور ذوق نے قصیدے کے چہرے کو غیر منطقی اور مصنوعی خیالات کی جس ضرب سے بگاڑ رکھا تھا۔ غالب نے اس کا بھرپور علاج کیا اور تجرباتی طور پر ایک ایسا قصیدہ لکھا جس کی تشبیب (چہرہ) کو اردو شاعری کا فکری سرمایہ کہنا چاہئے۔ یہ قصیدہ (دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں) اردو کے آفاق میں خیالات کی ایک بالکل نئی دنیا ہے۔

یہ قصیدہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدح میں لکھا ہے غالب کو جناب امیر رضی اللہ عنہ سے جو نسبت خاص تھی اور جس قلبی تعلق کو انہوں نے ذات حضرت سیدنا علی کرمہ اللہ وجہہ سے وابستہ کر رکھا وہ عشق و سرمستی اور والہانہ شیفتگی سے بھی کہیں بڑھ کر احسا عبدیت تک جا پہنچا تھا۔ اپنے ایک فارسی شعر میں تو یہاں تک کہہ دیا۔

منصور فرقہ ادا للہم منہم　　آوازۂ انا اسد اللہ بر انکنم

اس قصیدے میں غالب نے اپنے دل کا تمام تر حال اپنے ممدوح کے آگے کھول کر رکھ دیا ہے۔ کسی طرح کی کوئی لگی لپٹی رہنے نہیں دی ہے۔ گفتنی و ناگفتنی دل کے تمام وسوسے، ذہن کی خوب و ناخوب، ہر طرح کی باتیں کہہ دی ہیں۔ بعض مقامات پر خیال تو اس قدر گستاخانہ ہیں کہ اگر اس سب واردات قلبی کو خود اپنی ہی زبان سے ہرزہ گوئی نہ کہہ دیتے اور معذرت خواہانہ روئے کا اظہار نہ کیا ہوتا تو بات کہیں سے کہیں جا نکلتی۔

اس طرح غالب شناسی میں نفسیاتی رجحان کا تسلسل، تمثیلی رجحان، غزل کی نیرنگی، جدت ادا، ظرافت، تصوف، موسیقی، خوش بیانی، معنی آفرینی، مسلسل اشعار، رقیب کی فطری حیثیت، وغیرہ پر غالب شناسوں نے جامع تحقیقی کام کو انجام دیا ہے۔ غالب شناسی کے پس منظر میں اگر دیکھائے تو ان کے دیوان میں شامل ہر غزل کے ہر شعر کے توسط سے کسی نہ کسی عنوان اور کسی نہ کسی موضوع پر منفرد انداز سے تخیل کی نمائندگی اور فکر کی بالیدگی کا ثبوت ملتا ہے۔

لہذا لازمی ہے کہ مرزا غالب پر بے شمار کتابوں کا وجود ہوا اور ہر کتاب میں غالب شناسی کی مختلف موضوعاتی درجہ بندی دکھائی دیتی ہے۔

عبدالحفیظ رحمانی۔ایم۔اے۔ایم۔فل، پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

صحافت کی تعریف، مفہوم اور اہمیت

صحافت ایک وسیع اور جامع لفظ ہے۔ یہ لفظ عربی لفظ ''صحیفہ'' سے ماخوذ ہے: الصحیفۃ، الورقۃ المکتوب اور القرطاس المکتوب۔ اس کے لغوی معنی لکھا ہوا یا چھپا ہوا صفحہ ہے۔ مطلب 'تحریر شدہ کاغذ یا صفحہ' ہے۔ فن صحافت از عبدالسلام خورشید نے اس کی تعریف یوں کی ہے: ایسا مطبوعہ مواد ہے جو مقررہ وقفوں کے بعد شائع ہوتا ہے۔ انگریزی میں اس کا مترادف لفظ جرنل (Journal) ہے، جس کے معنی ''روزانہ حساب کا بہی کھاتہ'' ہے۔ ایک امریکی مصنف نے ''ایکپلو رنگ جرنلزم'' میں اس کی تعریف یوں لکھی ہے:

Journalism is te systematic and reliable dissemination of public information, public opinion, and public entertainment by modern mass media of communication.

مسٹر جی کے پوری نے صحافت کی تعریف جدید ٹکنالوجی کے پس منظر میں اس طرح کی ہے:

Journalism means the communication of information regarding the events of day through written words, sounds or pictures.

اس طرح یوں کہا جاسکتا ہے کہ صحافت روزانہ وقوع پذیر واقعات، حوادث، رونما پذیر چیزوں کی روداد ہے۔ یہ واقعات کی فوری تاریخ ہے۔ جسے ترتیب وتزئین کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں اپنے شہر یا بستی میں رونما ہونے والے واقعات، ملک کے دور دراز علاقوں میں پیش آنے والے حادثات، دنیا کے واقعات، معاشی ومعاشرتی حالات، ملی وسماجی مسائل سے آگہی، موسم کی تبدیلی، شیئر بازار کے نرخ، سونے چاندی کی قدر کا اتار چڑھاؤ، قومی اور بین الاقوامی سیاسیات، قدرتی آفات، کھیل کود اور تفریحی پروگرام سب کچھ شامل ہیں۔

اردو انسائیکلو پیڈیا (جلد ۳) میں صحافت کی تعریف یوں کی گئی ہے:

''اخبارات و رسائل اور خبر رساں اداروں کے لئے خبروں اور خبروں پر تبصرہ وغیرہ کی تیاری کو صحافت کا نام دیا جاتا ہے۔ یوں تو صحافت کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ انسانی تاریخ۔ لیکن جدید دور کی مطبوعہ صحافت کے فن نے پچھلے تین سو سال میں مختلف منزلوں سے گزر کر موجودہ شکل اختیار کی ہے۔'' لفظ صحافت سنتے ہی ہمارا ذہن پرنٹ میڈیا کی طرف چلا جاتا ہے۔ ابلاغ عامہ میں پرنٹ میڈیا کے علاوہ الکٹرانک میڈیا وغیرہ بھی شامل ہیں۔

صحافت فوری تاریخ ہے۔ ان چیزوں کی رپورٹ ہے جو کسی خاص وقت میں رونما ہوتی ہیں۔ صحافت بدلتے ہوئے منظر نامے کی تازہ ترین رپورٹ ہوتی ہے۔ اس کا مقصد قارئین کو یہ بتانا ہے کہ گرد ونواح میں کیا ہو رہا ہے۔

اس کی ترتیب وتحسین اور تحریر سے وابستہ 'صحافی' کہلاتے ہیں۔ اور اس پیشے کو صحافت کہا جاتا ہے۔ صحافت میں مذکورہ بالا تمام چیزیں ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ جدید زمانے میں یہ نہ صرف ایک پیشہ ہے، بلکہ صنعت ہے۔ اس کے پُر پیچ اور ناخوشگوار نتائج بھی ہوتے ہیں۔

زمانۂ جدید میں یہ نہ صرف ایک پیشہ ہے، بلکہ صنعت بھی ہے۔ اس کے دو اہم کام، ہیں: (۱) خبر دینا، خبریں مقامی بھی ہوسکتی ہیں، قومی اور بین قومی بھی۔ (۲) خبروں پر مبنی تبصرے اور رائے دینا۔ محاسن وعیوب کو اجاگر کرنا۔ قارئین کو اخلاق وآداب سکھانا، تفریح کا سامان فراہم کرنا تاکہ قارئین پوری طرح ملکی اور ثقافتی امور میں بھرپور حصہ لے سکیں۔ صحافت کی اصطلاح صرف ان لوگوں تک محدود نہیں جو اخباروں میں برسرروزگار ہیں، بلکہ یہ اصطلاح ان لوگوں کا بھی احاطہ کرتی ہے، جو جریدوں، بالخصوص مسلمہ اخبار یا میگزین کے لئے لکھتے ہیں، جو قارئین کے لئے باعث کشش ہو۔ اس طرح صحافی وہ لوگ ہوتے ہیں جو اخباروں اور جریدوں میں بہ حیثیت رپورٹر، قلم کار، مدیر، نائب مدیر، نامہ نگار، کالم نگار، فوٹو گرافر، فن کار، کارٹون ساز سے منسلک ہوتے ہیں۔

صحافت کا تعلق ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے بھی ہے۔ یہ خبریں پہنچاتے ہیں۔ حالات حاضرہ پر مختصر فلم تیار کرتے ہیں اور رواں تبصرے بھی پیش کرتے رہتے ہیں۔ مواد کو اکٹھا کرنا، انھیں ترتیب دینا اور ان کی تفسیر بیان کرنا صحافت کے دائرہ کار میں شامل ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید صحافت کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں: ''صحافت ایک عظیم مشن ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو تازہ ترین خبروں سے آگاہ کیا جائے، عصر حاضر کی تشریح کی جائے اور ان کے پس منظر سے واقف کروایا جائے تاکہ رائے عامہ کی تشکیل کا راستہ صاف ہو۔ صحافت رائے عامہ کی ترجمان اور عکاس ہوتی ہے۔ اور رائے عامہ کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ عوام کی خدمت اس کا مقدس فریضہ ہے۔''

اسی لئے صحافت کو ایک سماجی ادارہ کہا جاتا ہے۔ یہ ملک کی تعمیر وتشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ عوام میں سماجی اور سیاسی شعور بیدار کرنا، مثبت اور صالح اقدار کو فروغ دینا، سماج میں زندگی گزارنے والے مختلف طبقات کے درمیان پیار و محبت اور بھائی چارگی کے جذبات کو پروان چڑھانا اس کی بنیادی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔

صحافت صحت مند سماج اور مستحکم حکومت کی ضامن ہے۔ اس کے اندر اتنی طاقت وقوت ہے کہ اس کے اثر سے حکومتیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ نپولین بونا پارٹ نے اس کا مشاہدہ کرتے ہوئے کہا تھا: ''میں سو فوجی دستوں کے مقابلے میں ایک اخبار سے زیادہ ڈرتا ہوں۔''

انسان ابتدائے آفرینش ہی سے خبروں کا متلاشی رہا ہے۔ ابتدا میں اخبارات ورسائل کو ادب کے دائرے سے خارج سمجھا جاتا تھا۔ البتہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے اس کی طرف توجہ دی جانے لگی۔ ذرائع ابلاغ کی اہمیت کا احساس بڑھنے لگا۔ اردو میں اخبارات اور رسائل پر بھی تحقیقی کام شروع ہوا۔ اس موضوع پر سب سے پہلے گارساں دتاسی اور سید محمد اشرف نے قلم اٹھایا۔ پھر محمد عتیق صدیقی نے ''ہندوستانی اخبار نویسی'' (کمپنی کے عہد میں)، کوائف وصحائف، ''صوبہ شمال مغربی کے اخبارات و مطبوعات'' اور مولانا امداد صابری نے ''تاریخ صحافت اردو'' اور ''اردو کے اخبار نویس'' جیسی اہم کتابیں لکھیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے ''کاروانِ صحافت'' جیسی اہم کتاب لکھی۔

رسائل ذرائع ابلاغ میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اخبارات اس لحاظ سے ریڈیو اور ٹی وی پر ترجیح رکھتے ہیں کہ ریڈیو اور ٹی وی پر سنے گئے اور دیکھے گئے مناظر دوبارہ پیش نہیں ہوتے۔ البتہ اخبارات میں مطبوعہ مواد عرصہ تک محفوظ رہتا ہے اور کوئی بات ذہن سے نکل جائے تو انھیں دوبارہ اخبارات کے ذریعہ ذہن نشین کیا جاسکتا ہے۔ تاہم اخبارات کی فائل محفوظ رکھنا ایک مشکل کام ہے۔ البتہ رسائل باآسانی محفوظ کئے جاسکتے ہیں۔ ان میں ادبی رخ کو بھی زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ ایک بار پڑھنے کے بعد دوسری بار ان کا حوالہ بھی دیا جاسکتا ہے۔

رسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے کئی ضمنی اور فروعی پہلو سامنے آتے ہیں، جو نفس موضوع سے غیر متعلق نہیں ہوتے۔ مثلاً

کسی رسالہ کی اشاعت کس سن میں ہوئی۔ کتنی مدت تک شائع ہوتا رہا۔ اس کے موضوعات کیا تھے۔ ان کے ساتھ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ ان رسائل کی اشاعت کے محرکات کیا تھے اور وہ کون سے عوامل تھے جن کی وجہ سے یہ رسائل ایک مخصوص دور میں مقبولیت حاصل کر سکے۔ زبان و ادب کو ان سے کیا فائدہ پہنچا۔ غرض ان رسائل کے ذریعہ اس دور کی عصری حسیت، تہذیبی مزاج، تمدنی نظام، معاشرتی اقدار، سیاسی رخ اور سماجی گوشوں کی عکاسی ہوتی ہے۔

بہر حال خبر ایک اہم ضرورت ہے۔ یہ ہمارے ماحول سے ہم کو آشنا کرتی ہے۔ جس طرح ہم بولنے کی خواہش رکھتے ہیں، اسی طرح سننے کا بھی شوق ہوتا ہے۔ آج کی خبر کل کی تاریخ کا حصہ ہوتی ہے۔ ابتدائی دور کی بہت سی معلومات برباد ہوگئیں کیونکہ خبروں کو محفوظ رکھنے کا کوئی اچھا طریقہ موجود نہیں تھا۔ چھاپے خانہ کی ایجاد نے ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اس نے صحافت کو عوامی معلومات، رائے عامہ، عوامی معیشت، عوامی تفریحات کی باضابطہ اور مستند اشاعت کی سہولت فراہم کی۔ اس ایجاد نے ثابت کر دیا کہ صحافت انسانی زندگی کا ایک اہم ترین حصہ ہے۔ اس میں وقت کی بڑی اہمیت ہے۔ ایک لمحہ کی تاخیر صحافت کا کام بگاڑ سکتی ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ صحاف دراصل وقت کے ساتھ جنگ ہے۔ وقت تاریخ ساز ہے اور صحافت تاریخ کی محافظ۔

ہندوستان میں باضابطہ صحافت کا آغاز اس وقت ہوا جب ہندوستان چھاپہ خانہ سے روشناس ہوا۔ ۱۷۶۸ء میں پہلے ہندوستانی اخبار سے لے کر صحافت نے ایک طویل سفر کیا ہے۔ اس نے انگریزی استبداد بھی دیکھا، اور پہلی جنگ آزادی کے مصائب بھی سہے۔ آزادی کی تحریک میں بھی اردو صحافت نے نمایاں رول ادا کیا۔

ہندوستانی صحافت نے ترسیلی ٹکنالوجی سے مثبت اثرات قبول کئے ہیں۔ صحافت کے اطلاعاتی وسائل تک بدل گئے ہیں۔ انٹرنیٹ، فیاکس، ای میل اور کمپیوٹر نے خبروں کے حصول کے لئے نیوز ایجنسیوں کا رول کم کر دیا ہے۔ نئے اطلاعاتی ماحول اور اشتہاروں کے ذریعے سرمایے کی فراہمی نے صحافت کو اخبار اور افکار کا سنگم بنا دیا ہے۔ ان حالات میں صحافت ایک دلچسپ مشغلہ ہی نہیں بلکہ ایک بڑی صنعت کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ الکٹرانک میڈیا سے مسابقت کی وجہ خبروں کے ساتھ متنوع موضوعات کے لیے جگہ نکل آئی ہے۔ چنانچہ اخبارات کے صفحات اور ضمیمے سائنس، طب، مالیات، ماحولیات، تعلیم و فلسفہ اور مذہب جیسے کئی موضوعات پر لکھے گئے مضامین کا گلدستہ بن گئے ہیں۔

(مصادر: رہنمائے صحافت از نورالسلام ندوی؛ صحافت کے اصول از: پروفیسر اقبال احمد، صحافتی کہکشاں از: ڈاکٹر محمد محبوب فرید)

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر

UNANI CENTER FOR CARDIAC

Consultation Time
Morning:9:00 am to 3:00 pm-Evening:7:00 pm to 9:30 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowk Hyderabad - 500008 T.S India

سعیدہ رخسانہ بیگم۔ایم۔اے۔بی ایڈ۔یو پی ٹی، پی ایچ ڈی (اردو) ریسرچ اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

اردو صحافت، فن اور روایات

سب سے پہلے تو ہم یہ دیکھیں کہ صحافت کیا ہے؟ صحافت ایک وسیع اور جامع لفظ ہے۔ یہ عربی لفظ ''صحیفہ'' سے ماخوذ ہے۔صحیفہ کے لغوی معنی کتاب یا رسالہ کے ہیں۔ بہرحال عملاً ایک عرصہ دراز سے صحیفہ سے مراد ایسا مطبوعہ مواد ہے جو مقررہ وقفوں کے بعد شائع ہوتا ہے۔ چنانچہ تمام اخبارات ورسائل صحیفے ہیں۔اور جو لوگ ان کی ترتیب وتحسین سے وابستہ ہیں، انھیں صحافی کہا جاتا ہے۔اور ان کے پیشے کو صحافت کا نام دیا گیا ہے۔ صحافت کا انگریزی مترادف 'جرنلزم' (Journalism) ہے۔ آج کل صحافت کا دائرہ اس قدر وسیع ہوتا جارہا ہے کہ اس کی تعریف کو چند لفظوں میں سمیٹنا بہت مشکل ہے۔ اخبار کا معمولی ملازم بھی خود کو صحافی کہلانا باعث افتخار سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ فلمی رسالوں میں کام کرنے والے بھی اپنے نام کے ساتھ جرنلسٹ لکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

آج صحافت کا دائرہ اخبارات، فلم، ٹیلی ویژن، کتابوں اور میگزین سے نکل کر انٹرنیٹ، موبائل، آؤٹ آف ہوم میڈیا سمیت ان گنت میدانوں تک وسیع ہو چکا ہے۔ صحافت ایک عظیم لیکن ترقی پذیر فن ہے۔اسے جمہوریت کا چوتھا ستون تسلیم کیا گیا ہے۔رائے عامہ ہموار کرنے، حکومت بنانے اور بگاڑنے میں اس کا موثر رول ہوتا ہے۔

صحافت کی تاریخ کافی پرانی ہے۔تقریباً ساتویں صدی قبل مسیح میں رومن دور حکومت میں روزانہ ایک قلمی نسخہ شائع کیا جاتا تھا، جس میں سرکاری اطلاعات، اعلانات، جنگ سے متعلق خبریں ہوتی تھیں۔اس کو 'ایکٹا ڈاورینا' (Acta Diurna) کہا جاتا تھا۔ ہندوستان میں بھی عہد قدیم میں ہر پانچ گاؤں، دس گاؤں، بیس گاؤں کی خبریں صوبہ دار تک اور پھر راجاؤں تک پہنچائی جاتی تھیں۔ سلاطین دہلی نے خبروں کی ترسیل کا زیادہ بہتر طریقہ اپنایا۔ ہر تین کوس کے فاصلہ پر ایک سرائے ہوتی اور وہاں ایک ہرکارہ متعین ہوتا۔ پہلی منزل کا ہر کارہ دوسری منزل کے ہرکارے تک اطلاع پہنچاتا تھا۔اسی طرح ٹپہ مرکزی حکومت تک پہنچتا تھا۔محمد بن تغلق نے اس نظام میں مزید بہتری پیدا کی۔اس نے ہر تین میل کے فاصلہ پر دو چوکیاں مقرر کیں۔ ان چوکیوں پر ہمیشہ تین گھوڑسوار متعین ہوتے جو ٹپہ لے کر اگلی چوکی تک پہنچاتے تھے۔

مغلوں کے عہد میں ہر قصبہ وشہر میں پرچہ نویس ہوتے جو مقامی واقعات کو لکھ کر بادشاہ کو پہنچاتے تھے۔ان کے علاوہ محکمہ خفیہ بھی قائم تھا، جس کے اراکین معلومات کو جمع کر کے خفیہ طور پر بادشاہ تک پہنچاتے تھے۔ مغل دور میں کبوتروں کو بھی خبر رسانی کی خاص تربیت دی جاتی تھی اور ان سے بسرعت پیغام بھیجا جاسکتا تھا۔ مانڈو سے برہان پور تک ٹپہ صرف تین ساعتوں میں پہنچ جاتا تھا۔

ہندوستان میں باضابطہ صحافت ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کے بعد شروع ہوا۔ پہلا اخبار انگریزی میں نکلا۔اس کا نام 'ہکی بنگال گزٹ' تھا۔ یہ ۲۹۔جنوری ۱۷۸۰ء کو کلکتہ سے جاری ہوا۔ایک اور اخبار 'کلکتہ گزٹ' تھا جس میں انگریزی کے ساتھ بنگالی اور فارسی میں بھی کبھی کبھی خبریں چھپ جایا کرتی تھیں۔ فروری ۱۷۸۵ء کو 'بنگال جرنل' کے نام سے ایک ہفتہ وار منظر عام پر آیا۔۱۷۹۹ء میں 'ایشیاٹک مرر' کا اجرا عمل میں آیا۔

انیسویں صدی میں ہندوستان میں کئی چھاپے خانے قائم ہوئے۔ان کے قائم ہونے سے اخبارات کو مزید

پھیلنے اور پھولنے کا موقع ملا۔ گنگا دھر بھٹا چاریہ نے بنگالی میں پہلا ہندوستانی زبان کا اخبار 'بنگال گزٹ' نکالا۔

ہندوستان میں اردو صحافت کی تاریخ کا آغاز 'جام جہاں نما' سے ہوتا ہے۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا۔ اس کے مدیر منشی سدا سکھ تھے۔ یہ ۲۷۔ مارچ ۱۸۲۲ء کو کلکتہ سے شائع ہوا۔ ان دنوں ادبی حلقوں میں اردو کا چلن زیادہ نہ تھا۔ اس لئے اس اخبار کی بہت زیادہ پذیرائی نہیں ہوئی۔ اور یہ بند ہوگیا۔ مئی ۱۸۲۴ء میں یہی اخبار فارسی میں چھپنے لگا۔ اس کے بعد بمبئی سے شائع ہونے والے "آئینۂ سکندری" نے ۱۸۳۲ء میں اردو میں ایک ضمیمہ شائع کرنا شروع کیا۔

البتہ ۱۸۳۶ء میں دہلی سے "اردو اخبار" دہلی سے شائع ہونے لگا۔ اس اخبار کے ایڈیٹر مولوی محمد باقر حق گو اور بے باک انسان تھے۔ انہوں نے اردو صحافت کو خونِ جگر سے سینچا۔ اس اخبار نے غدر ۱۸۵۷ء میں اہم رول ادا کیا تھا۔ انگریزی حکومت کے خلاف لکھنے سے جھجکتے نہیں تھے۔ آزادئ رائے اور جرأت گفتار کی پاداش میں کمپنی کی حکومت نے انھیں گرفتار کرلیا اور جمنا پار لیجا کر گولی ماردی۔ اس طرح یہ پہلا شہید صحافی ہے جس نے آزادئ وطن کی خاطر جان دی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے سرکاری اور حکومتی مصلحتوں کی بنا پر ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ تو اردو سے لوگ کافی حد تک آشنا ہوئے۔ حکومت نے اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا تو اردو ادب اور صحافت نے بہت تیزی کے ساتھ ترقی کی۔ بمبئی اور مدراس سے کئی اخبارات نکلنے شروع ہوئے۔ ۱۸۵۵ء مین بمبئی سے "کشف الاخبار" منشی امان علی کی ادارت میں شائع ہوا۔ جامع الاخبار مدراس سے شائع ہوا۔ یہ مدراس سے اردو کا پہلا اخبار تھا۔ اپنے لوازم اور متن اور حسن ترتیب کے اعتبار سے یہ انگریزی پیٹرن پر شائع ہوتا تھا۔ اس میں نہ صرف دیسی والیان ریاست اور شاہانِ دہلی اور لکھنو کی بدانتظامی اور سلطنت سے لاپرواہی کی خبریں چھپتی تھیں بلکہ کمپنی بہادر کی سرکار سے بھی بے زاری کا احساس ہوتا تھا۔

ان اخبارات کے علاوہ انیسویں صدی کے نصف تک اور بھی بہت سے اخبارات مدراس، بمبئی، دہلی، آگرہ، لکھنو اور پٹنہ سے شائع ہوئے۔ ان میں سے کچھ کے نام درج ذیل پیش کیے جاتے ہیں:

صدر الاخبار	آگرہ	۱۸۴۶ء
لکھنؤ اخبار	لکھنؤ	۱۸۴۷ء
عمدۃ الاخبار	بریلی	۱۸۴۷ء
مالوہ اخبار	اندور	۱۸۴۹ء
کوہ نور	لاہور	۱۸۵۰ء
نور الابصار	الہ آباد	۱۸۵۲ء
نور الانوار	آرہ (بہار)	۱۸۵۳ء
عمدۃ الاخبار	بمبئی	۱۸۵۴ء
ہرکارہ	پٹنہ	۱۸۵۵ء
ویکلی رپورٹ	گیا	۱۸۵۶ء

[مصادر: رہنمائے صحافت از نور السلام ندوی]

خانقاہ بلالیہ صابریہ چشتیہ

الحمدللہ اس خانقاہ میں آیات قرآنی، مسنون دعائیں، چہل قاف، حزب البحر اور اسماء الحسنی کے ذریعہ ہر قسم کے جادو و جنات اور بندش وغیرہ کا مؤثر و کامیاب علاج کیا جاتا ہے۔ ان شاء اللہ 10 تا 15 دن میں علاج مکمل ہوجائے گا۔

رابطہ کیجئے: عامل کامل مولانا مشیر الدین مظاہری خلیفہ، پیر کامل حضرت مولانا شاہ سید بلال حسین تھانوی چشتی قادری صابری نقشبندی سہروردی سے

اوقات: صبح 10 تا 4 بجے دن (جمعہ تعطیل)

مقام: مادنا پیٹ، سعید آباد، حیدرآباد۔

فون 9849504398

MADRASA ISLAMIA NAJMUL ULOOM
Shahi Hills, Near Masjid Noor Ali, Shaheen Nagar, Hyderabad.
SHIBLI INTERNATIONAL
EDUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم
شاہی ہلز نزد مسجد نور علی، شاہین نگر، حیدرآباد
Regd No: 180/2016

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ.....گرامی قدر محترم! امید ہے کہ آپ اپنے متعلقین کے ساتھ بخیر وعافیت ہوں گے

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے خَیْرُکُم مَن تَعَلَّم القُرآن وَعَلَّمَہ ۔تم میں سے بہترین انسان وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔اس حدیث سے علم اور قرآن علم کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اسی علم کی نشر واشاعت کے لئے **مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم** شاہی ہلز شاہین نگر حیدرآباد میں ۱۵ر جنوری ۲۰۱۷ء کو قائم کیا گیا تا کہ امت مسلمہ کے نونہالان زیور علم سے آراستہ ہوں اور ملک وملت کی خدمت میں وقف ہوجائیں۔اللہ رب العزت ان مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔آمین یارب العٰلمین۔

مدرسہ ہذا اور ٹرسٹ کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے۔جملہ اخراجات کی ادائیگی اہل خیر حضرات کے تعاون سے ہوتی ہے۔ٹرسٹیوں کے مشورے سے ٹرسٹ اور مدرسہ کے لیے تین سو ستائیس (327) رگز زمین شاہی ہلز شاہین نگر میں خریدی جاچکی ہے، جس کی مجموعی قیمت چھتیس لاکھ ستّر ہزار تھی۔الحمدللہ اہل خیر کے تعاون سے بیشتر رقم ادا کردی گئی ہے، ابھی اس مد میں ادارہ دس لاکھ کا مقروض ہے۔ماشاءاللہ تعمیری کام جاری ہے۔ اس لیے اہل خیر حضرات سے گذارش ہے کہ نقد اور اشیاء سے تعاون فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔نوازش ہوگی۔

Bank Name: IDBI CURRENT ACCOUNT
A/c Number: 1327104000065876
A/c Name: SHIBLI INTERNATIONAL EDUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFSC Code: IBKL0001327. Branch: Charminar

حافظ وقاری مفتی ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی خطیب مسجد عالیہ، بانی وناظم مدرسہ ہذا چیرمین شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

Google Pay: **8317692718** WhatsApp: **9392533661**

Urdu Monthly
SADA E SHIBLI
Hyderabad

Nov. 2021

RNI: TELURD/2018/77022
ISSN: 2581-9216

Rs. 20/-

مجتبیٰ ٹکسٹائلس

MUJTABA
TEXTILES FOR THE GENTLEMAN IN YOU

#20-4-20/6/1, 20-4-20/7/5 & 7/6, Punch Mohalla, New Laad Bazar,
Khilwath, Hyderabad. T.S. India
Ph: +91 6281040896 - Email: mujtabatextiles18@gmail.com - Web: www.mujtabatextiles.com
Follow us on facebook: https://www.facebook.com/mujtaba.textiles.1

Editor, Printer, Published & Owned by Mohd. Muhamid Hilal
Printed at Daira Electric Press, #22-8-143, Chatta Bazar, Hyderabad. 500 002.
Published at #17-3-352, B1, 2nd Floor, Bafana Complex, Dabeerpura, Hyderabad - 23, T.S
Cell: 9392533661, 8317692718, Email: muhamidhilal@gmail.com